تذکرۂ سائلؔ

حفیظ الرحمان واصف

ناشر
ادارہ ادبیات دلی - ۲۰۰۹ - قاسم جان اسٹریٹ دلیؔ

تذکرۂ سائل

یعنی دہلی کے مشہور اور جلیل القدر شاعر نواب ابوالمعظم
مرزا سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی کے مختصر حالات

از حفیظ الرحمان واصف

ناشر	ادارۂ ادبیات (دہلی)
نام مطبع	جید برقی پریس دہلی
تعداد طباعت	پانچ سو
ایڈیشن بصورت کتاب	طبع اوّل
تعداد صفحات مع ٹائیٹل	۱۵۶
سال طباعت	۱۹۷۵ء
نام کاتب	منظور الدین خوشنویس دہلی
نام مصحح	حفیظ الرحمان واصف وغیرہ
قیمت کتاب غیر مجلّد	چھ روپئے

اس کتاب کے ملنے کا پتہ :-

ادارۂ ادبیات ، احاطہ کالے صاحب
گلی قاسم جان - دہلی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ اللہ العلی العظیم۔ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

راقم الحروف حفیظ الرحمان واصف ابن حضرت مفتی اعظم علامہ مولانا محمد کفایت اللہ رحمۃ اللہ علیہ عرض کرتا ہے کہ اُستاد مرحوم نواب ابوالمعظم مرزا سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی کی وفات کے بعد میں نے ان کے کچھ خاندانی اور ذاتی حالات جمع کرکے قلم بند کیے تھے اور ارادہ تھا کہ کتابی صورت میں "تذکرہ سائل" کے عنوان سے ان کے عقیدت مندوں کے سامنے پیش کروں گا۔

اس کے بعد ۱۹۴۷ء کا انقلاب آگیا۔ یہ ارادہ پورا نہ ہوا۔ اور ماحول کے انتشار کے ساتھ ذہنی انتشار اتنا شدید ہوا کہ ہمت پست ہوگئی۔ لیکن اپنی محنت کو یوں ہی ایک طرف ڈال دینا اور دیمک کی نذر کر دینا بھی گوارا نہ تھا۔ بالآخر مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانی کے سپرد کر دیا۔ انھوں نے اپنے موقر رسالہ ماہنامہ "برہان" میں اس کو ماہ جون ۱۹۴۹ء سے فروری ۱۹۵۰ء تک نو قسطوں میں شائع کیا۔

حاجی محمد نسیم مرحوم بٹن والے مالک فرم عزیز اینڈ سنز صدر بازار دہلی کے فرزند ارجمند عزیزم میاں شمیم احمد کناڈا میں ٹورنٹو یونیورسٹی کی لائبریری سے تعلق رکھتے ہیں۔ چند ماہ پیشتر انھوں نے وہاں سے مجھے خط لکھا اور مقالہ کو کتابی صورت میں شائع کرنے کی ضرورت ظاہر کی۔ سبحان اللہ! یہ غریب الوطن اُردو دیس نکالا ملنے کے بعد کہاں کہاں پہنچی اور کہاں کہاں اس کا پرچم لہرا رہا ہے۔

ادارہ ادبیات جو عزیزہ موصوف اور ان کے احباب کے اشتراک و تعاون سے

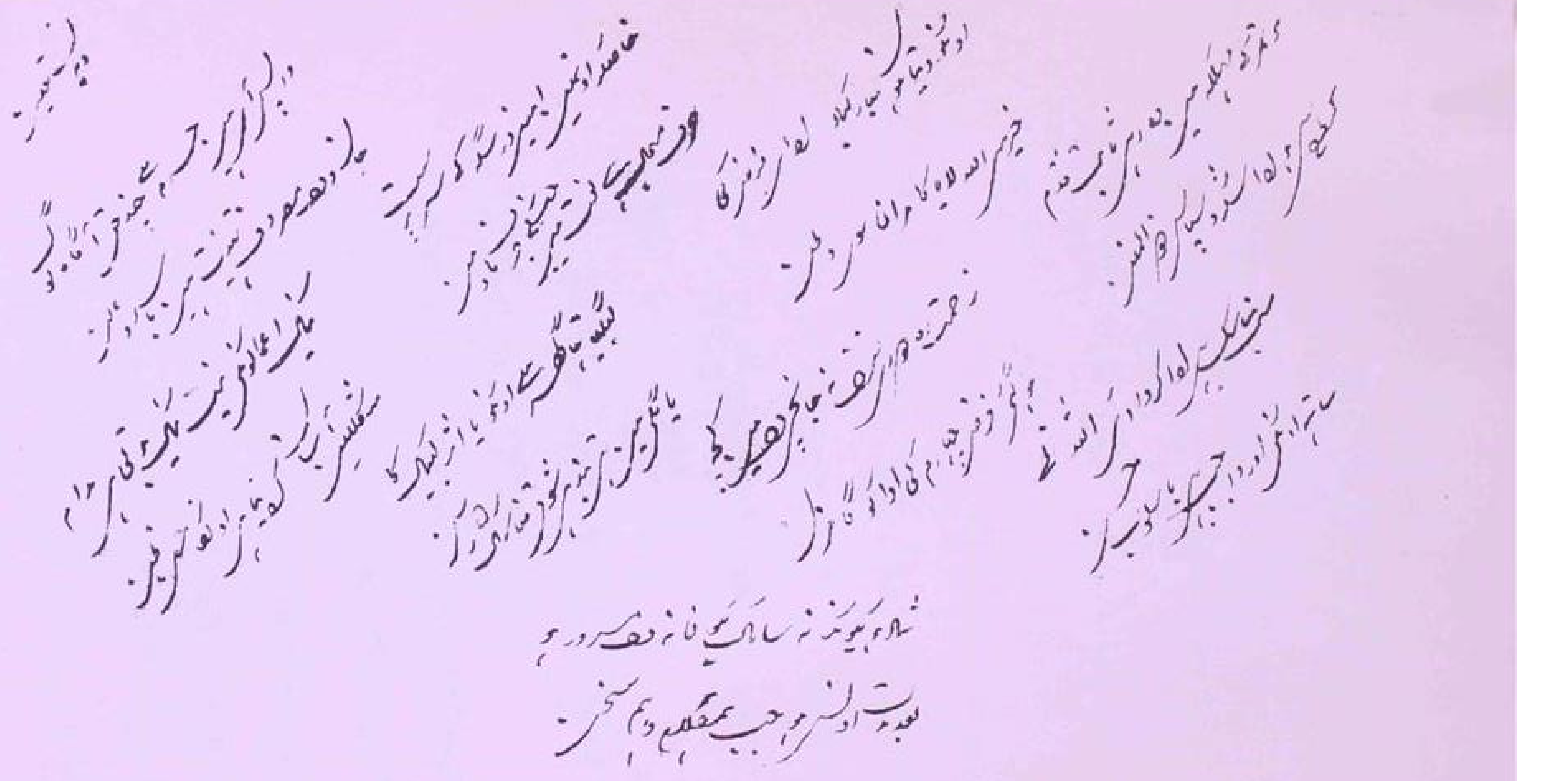
دہلی میں قائم ہے اور کئی علمی اور ادبی کتابیں شائع کر چکا ہے۔ اب یہ تذکرۂ سائل نظر ثانی اور ترمیم و اضافہ کے بعد اسی ادارہ کی طرف سے شائع ہو رہا ہے۔ اس ایڈیشن میں کچھ نمونۂ کلام بھی شامل کر دیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں محب محترم مولانا امداد صابری کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ کچھ کلام انھوں نے مہیا کر کے مرحمت فرمایا۔

حاجی محمد نسیم مرحوم کو حضرت مفتی اعظم رحمہ سے بہت محبت و عقیدت تھی۔ اور حضرت مفتی اعظم رح بھی حاجی صاحب موصوف پر اعتماد فرماتے تھے۔ میں بھی ان کے فرزندانِ گرامی قدر کو عزیز رکھتا ہوں۔ اس وجہ سے میں نے ادارۂ ادبیات کو بغیر کسی معاوضے کے تذکرۂ سائل کا یہ پہلا ایڈیشن شائع کرنے کی اجازت دی ہے۔ اور آئندہ اس کے جملہ حقوق میرے لئے محفوظ ہیں۔

امید ہے کہ یہ حقیر کاوش ہماری عظمتِ گزشتہ کی ایک مستند دستاویز ثابت ہوگی

غرض نقشے ست کز ما یاد ماند
کہ ہستی را نمی بینم بقائے

احقر حفیظ الرحمان واصف
مہتمم مدرسہ امینیہ اسلامیہ
کشمیری دروازہ دہلی
مورخہ یکم مارچ ۱۹۷۵ء



عکس تحریر حضرت سائل

یہ قطعہ حضرت سائل نے اس عصرانہ کے موقع پر لکھا تھا جو حضرت مفتی اعظم مولانا کفایت اللہ کے اعزاز میں ان کے سفر حجاز سے واپسی پر طلبۂ مدرسہ امینیہ دہلی کی طرف سے دیا گیا تھا۔ اجتماع مورخہ ۲۰ راگست ۱۹۲۶ء کو مدرسہ امینیہ میں منعقد ہوا تھا۔ اس میں مندرجۂ ذیل حضرات بھی شریک تھے۔ مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی، حکیم محمد اجمل خان، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مولانا احمد سعید، مولانا محمد عرفان، مسٹر شعیب قریشی، ڈاکٹر عبد الرحمٰن صدیقی، مسٹر عبد العزیز انصاری وغیرہم

(واصف)

تمہید

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را

گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

آج کل اُردو زبان کو بگاڑ کر ایک نئی زبان بنانے کی اور اس کے لئے ہندی رسم الخط رائج کرنے کی زبردست کوشش کی جارہی ہے۔ اتنی زبردست کوشش ملک کو آزاد کرانے کے لئے کی جاتی تو غالباً نصف صدی قبل ہی ملک آزاد ہوچکا ہوتا۔ کاش کہ اب ملک کے آزاد ہوجانے کے بعد ہندوستانی قوم اس کی تعمیر و ترقی کی طرف اپنی تمام قوتیں متوجہ کرتی اور ایک صدی کی برطانوی تخریب کا علاج کرتی! مگر افسوس ایک ہزار برس میں ہندوستان کے تمام فرقوں کے اشتراکِ عمل سے جو تمدن بنا تھا اس کو آج بیگانہ سمجھا جارہا ہے اور مسلمانوں سے مطالبہ کیا جارہا ہے کہ ہندوستان میں رہنا ہے تو اپنا تمدن (کلچر) چھوڑنا پڑے گا۔ یہ صرف مطالبہ ہی نہیں بلکہ اس کے لئے سخت جدوجہد کی جارہی ہے مگر یہ بالکل بے دلیل اور بے سوچی سمجھی بات ہے۔ غالباً ان لوگوں نے اس حقیقت کو نہیں دیکھا کہ ہندوستانی مسلمانوں کا اپنا کوئی خاص تمدن نہیں ہے۔ ان کا تمدن وہی ہے جو ہندوستان کے تمام باشندوں کا ہے غیر ملکی تمدن کو انھوں نے اسی وقت خیرباد کہہ دیا تھا جب انھوں نے ہندوستان کو اپنا وطن بنا لیا تھا۔ وہ ہندوستان کی دولت اور پیداوار کو کسی دوسرے ملک کا پیٹ

بھرنے کے لئے نہیں لے گئے۔ نہ کسی دوسرے ملک کو اس کی اجازت دی کہ وہ اپنا اُلو سیدھا کرنے کے لئے ہندوستان کو آلۂ کار بنائے تمام فرقوں کے اشتراک سے ایک تمدّن کی بنیاد پڑ گئی حتّیٰ کہ اس کے لئے بعض شوریدہ سروں نے مذہب کی وحدت کو بھی ضروری سمجھا اور اکبر بادشاہ کے عہد میں یہ کوشش کی گئی کہ ہندوستان میں ایک ایسی عظیم الشان قومی وحدت قائم کی جائے جس میں کسی قسم کی تفریق و امتیاز کا شائبہ نہ رہے لیکن یہ نظریہ ناکام رہا اور چھوت چھات کی صورت میں اس کا عظیم ردِّ عمل ہوا۔ اس کے باوجود تمدن کا اشتراک رہا اور آج تک ہے۔ اب اگر کسی نئے تمدّن کی طرف دعوت دی جا رہی ہے تو صرف مسلمانوں کو نہیں بلکہ تمام ہندوستانیوں کو اپنا تمدن چھوڑ کر نیا تمدن اختیار کرنے کی دعوت دینی چاہیئے۔ مگر ان مدعیوں نے اب تک اس نئے تمدن کی سراغ رسانی نہیں فرمائی ہے اس لئے ابھی ہمیں اس بات کا انتظار ہے کہ وہ نیا تمدّن کیا ہوگا۔

یہ ایک لسانی کلیہ ہے کہ نئی زبان ہمیشہ مختلف قوموں کے اشتراک اور اختلاط سے بنتی ہے۔ قانون سے نہ کوئی زبان بن سکتی اور رائج ہو سکتی ہے اور نہ مٹائی جا سکتی ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے ایک ہزار برس کے عہدِ حکومت میں سرکاری زبان فارسی وغیرہ رہی اور انگریزوں کے دو سو برس کے زمانہ عروج میں انگریزی کا عروج رہا لیکن نہ فارسی ہندوستان کی ملکی زبان بن سکی نہ انگریزی بلکہ ایک بین الاقوامی زبان خود بخود بن گئی اور یہ زبان سب سے بڑی دلیل ہے اس بات کی کہ ہندوستان کے ہندو مسلمانوں کا تمدّن جدا جدا نہیں ہے۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ اب آزادی ملنے کے بعد بعض لیڈر کو نسے تمدن کی طرف مسلمانوں کو لانا چاہتے ہیں۔ انگریزوں کے دو سو برس کے عروج کے زمانہ میں باوجودیکہ ہندوستان میں بھی انگریزی زبان کا عروج رہا اور آج تمام دنیا کی بین الاقوامی زبان بھی انگریزی بن گئی ہے مگر ہندوستان کی مشترک زبان جو تھی

وہی رہی اور آج تک ہندوستانی ادب میں انگریزی کے چند الفاظ بھی راہ نہ پا سکے۔ اگر قانون کی طاقت اور حکومت کے جاہ و جلال سے کوئی زبان بن جایا کرتی تو انگریزوں کے عہد میں ہندوستانی ادب میں انگریزی بھی داخل ہو جاتی اور ضرور کوئی نئی زبان بن جاتی۔ مگر نئی زبان کیونکر بنتی انگریزوں نے ہندوستان کو نہ اپنا وطن سمجھا نہ اپنے ملکی تمدن کو چھوڑا نہ اپنے ذہن سے اپنے ملکی و وطنی رجحانات کو محو ہونے دیا۔ ان کا تمدن، تہذیب زبان اور رنگ روپ بالکل اجنبی اور بیگانہ ہی رہا۔ کسی ملک کی وحدت کو قائم رکھنے کے لئے اور افراد کی قوت کو ملک کی تعمیر میں لگانے کے لئے نہایت ضروری ہے کہ آپس میں ادائے مطالب کے لئے ایک ہی زبان ہو۔ ایسا نہ ہوا تو ملک کی ترقی صدیوں پیچھے جا پڑے گی۔ جو لوگ ایک نئی زبان گھڑنے کی فکر میں سرگرداں ہیں کیا اچھا ہوتا کہ اتنا وقت وہ دوسرے تعمیری کاموں میں صرف کرتے۔ صنعت و حرفت اور تجارت بین الاقوامی تعلقات کے بغیر ترقی نہیں کر سکتے۔ ہم کو متحد ہو کر دنیا کی سائنسی دوڑ میں شامل ہونا چاہیے تھا۔ اگر ملک کی اکثریت زبان اور چھوت چھات کے بکھیڑوں میں پھنسی رہی اور یونہی اپنا وقت ضائع کرتی رہی تو جب تک ہم نیا تمدن بنا کر اور نئی زبان سیکھ کر فارغ ہوں گے دنیا کہیں سے کہیں پہنچ چکی ہو گی۔ ملک کے سامنے زبان سے زیادہ بہت سے اہم مسائل ہیں ہم کو ان کی طرف متوجہ ہونا چاہیے اور جو زبان پہلے سے بولی اور سمجھی جاتی ہے اُسی سے کام لینا چاہیے۔

کوئی زبان نہ خود بنتی ہے نہ خود فنا ہوتی ہے اس لئے یہ بالکل واضح حقیقت ہے کہ ملک کے بعض لیڈروں کا جو قیمتی وقت اُردو کے خلاف محاذ بنانے میں صرف ہو رہا ہے وہ بالکل رائگاں ہے۔ ہونا یہ چاہیے تھا کہ آزادی کے بعد کے یہ بے بہا لمحات ملک کے دفاع و اقتصاد اور امن و اتحاد پر صرف کیے جاتے۔ مگر افسوس کہ اس وقت اردو کی کچھ اس انداز سے مخالفت کی جا رہی ہے کہ گویا مسلمان بادشاہوں

نے اس زبان کو ہندوستانیوں کے منھ میں زبردستی ٹھونس دیا تھا اس کو اب اُگل دینا چاہیے۔ حالانکہ اسلامی حکومت کے انحطاط کے وقت سے اُردو نے ترقی شروع کی اور زوال کے بعد وہ ایک ترقی یافتہ عالمگیر زبان بنی۔ یہی تو کبیر داس اور امیر خسرو کی زبان ہے جو نکھر نکھر اکر داغ کے زمانے میں اُردوئے معلّیٰ کہلائی اور پنڈت رتن ناتھ سرشار، منشی پریم چند کی زبان بنی۔

انڈین نیشنل کانگریس جو ہندوستان کے تمام عناصر کی واحد نمائندہ جماعت ہے جب اس نے یہ محسوس کیا کہ اکثریت کے انتہا پسند طبقہ میں لفظ اُردو سے نفرت کی جانے لگی ہے اور کچھ ایسا سمجھا جانے لگا ہے کہ گویا یہ مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے اور فرقہ پسند افراد اس لفظ سے چڑنے لگے ہیں تو اس نے اس لفظ کو ترک کر دیا اور ہندوستان کی مشترک زبان کو ہندوستانی کا لقب دیا۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہندوستانی زبان کے سوا کسی زبان میں یہ اہلیت نہیں ہے کہ وہ تمام ہندوستان کی سرکاری زبان بن کر قومی و ملکی وحدت کو باقی رکھ سکے۔

اس مضمون کے شائع ہونے کے بعد غالباً اگست ۱۹۴۹ء میں انڈین نیشنل کانگریس نے پہلی تجویز کو رد کر کے ملک کے لئے ہندی زبان کو برسم الخط دیوناگری سرکاری زبان تسلیم کرنے کی سفارش کی۔ ہندوستان کی پارلیمنٹ نے بھی اس کی تصدیق کی۔ اور ہندوستان کی سرکاری زبان ہندی اور رسم الخط دیوناگری قرار دیدیا گیا۔ اب ریڈیو میں خبریں سنتے وقت کہا جاتا ہے: "اب آپ ہندی میں سماچار سُنیئے" پہلے کہا جاتا تھا "اب آپ ہندوستانی میں خبریں سُنیئے"۔ اچھا ہوا کہ لفظ ہندوستانی کا پردہ ہٹ گیا اور اردو بولنے والوں کو اس فریب سے نجات ملی۔

اُردو زبان کی ادبی حیثیت آج تک وہی ہے جو داغ نے قائم کی تھی جس نہج پر داغ نے زبان کو نکھارا اور لغات و تراکیب کو مرتب کیا تھا اس سے بہتر تبدیلی

اب تک نہیں ہوئی - اس لحاظ سے زبان کے اس آخری دور کا مورثِ اعلیٰ صرف داغ مرحوم کو کہا جا سکتا ہے - داغ مرحوم اور ان کے تلامذہ دورِ حاضر کی عالمگیر اور صالح زبان کے معمار ہیں - بڑی بدنصیبی ہوگی اگر ہندوستانی قوم ان حضرات کے حالات سے ناواقف رہے جنھوں نے ہندوستانی ادب کو نکھار کر ایک بین الاقوامی زبان بننے کے قابل بنایا -

ستمبر ۱۹۴۷ء (شوال ۱۳۶۵ھ) میں ہندوستان اور خاص کر دلی اور پنجاب میں جو خونیں انقلاب آیا اس کے نتیجہ میں دلّی پر صرف پنجاب ہی نہیں بلکہ تمام مغربی اضلاع کی تہذیب چھا گئی - اور اب دہلی بڑا ہی عجیب و غریب شہر نظر آنے لگا - کثرتِ آبادی کی وجہ سے نہایت آباد لیکن دیدۂ عبرت کے لئے یکسر ویران جن لوگوں کے دم سے دہلی کی بچی کھچی روایات باقی تھیں سب منتشر ہوگئے یا بۃِ تیغ ہوئے - شاندار عمارتیں، درسگاہیں، اور علوم و فنون کے بے بہا ذخیرے نذرِ آتش ہوئے - اس آٹھویں بربادی کے بعد زبان کے لحاظ سے دہلی کی علمی مرکزیت ختم ہوئی - اور ممکن ہے کہ دنیا کچھ عرصہ کے بعد زبان کے ان اولوالعزم معماروں کو بھول جائے جنھوں نے ہندوستانی ادب کی خدمت کے لئے اپنی عمر کے بہترین لمحات صرف کیے -

اِن میں سے ایک درخشندہ ستارہ حضرت ابوالمعظم نواب سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی کی ذاتِ گرامی تھی جو خاندان لوہارو کے ایک ممتاز فرد اور دہلی کی قدیم تہذیب کے ایک مکمل نمونہ تھے اور جہاں استاد داغ مرحوم کے عزیز ترین شاگرد تھے - داغ مرحوم کے دہلی کے شاگردوں میں سے چار دلّی والے مشہور ہیں - ایک سائل مرحوم، دوسرے آغا شاعر مرحوم، تیسرے حضرت سید وحید الدین بیخود دہلوی چوتھے پنڈت تربھون ناتھ زتشی المتخلص بہ زار دہلوی -

ضروری ہے کہ دلّی کے اس آخری دَور کے تمام مشاہیرِ ادب کے حالات قلمبند کیے جائیں۔ فی الحال اس سلسلے کو میں اپنے اُستاد جناب سائلؔ مرحوم سے شروع کرتا ہوں۔ اگر حالات سازگار رہے تو ممکن ہے کہ دیگر حضرات کے حالات قلمبند کرنے کا موقع مل جائے یا اور کسی اہلِ قلم کو اس اہم ادبی خدمت کے انجام دینے کا خیال آجائے۔

افسانۂ یارانِ کہن خواندم و رفتم   دریاب! کہ لعل و گہر افشاندم و رفتم

سائل صاحب کے آبا واجداد اور خاندان

مغل بادشاہ عزیزالدین عالمگیر ثانی (المتوفی ۱۷۵۹ء) کے عہد میں[1] تین تورانی بھائی سمرقند سے ہندوستان میں وارد ہوئے۔ قاسم جان۔ عارف جان۔ عالم جان۔ (عارف جان ہمارے سائلؔ مرحوم کے دادا کے دادا ہیں)

آبحیات میں مولانا محمد حسین آزاد نے لکھا ہے کہ خاندان لوہارو کا سلسلۂ نسب حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے ملتا ہے۔ یہ تورانی بھائی حضرت علی کے چھوٹے فرزند محمد بن حنفیہ کی اولاد میں تھے؛

لیکن خاندان لوہارو کے اکابر اس انکشاف کی تردید کرتے ہیں۔ نواب علاءالدین احمد خاں علائی کے پوتے عالی جناب نواب ناصرالدین احمد خاں عرف خسرو مرزا گلی قاسم جان میں رہتے ہیں۔ تقریباً ۸۵ برس کی عمر ہے۔ وہ اپنے خاندان کے ہاشمی النسب (علوی) ہونے سے انکار فرماتے ہیں۔ اپنے مورثِ اعلیٰ کو عجمی النسل (ترک یا مغل) بتاتے ہیں۔

نواب سر امیرالدین احمد خاں عرف فرخ مرزا کے پوتے میجر نواب مرزا

---

[1] واقعاتِ دارالحکومت دہلی جلد دوم صفحہ ۲۴۷ و جلوۂ داغ صفحہ ۹

امین الدین احمد خاں نے اپنی تازہ تصنیف "مثنوی انبساط و انتشار" میں لکھا ہے :-

قبیلہ جو مغلوں میں برلاس ہے — جری ہے بہادر ہے حساس ہے
اسی کے یہ تینوں تھے چشم و چراغ — یہ عالی نظر اور عالی دماغ
بخارا ہیں کوچہ تھا پستہ شکن — جو تھا ان کا گھر اور پیارا وطن

مذکورہ زندہ شواہد کے بعد مولانا محمد حسین آزاد کی تاریخی اُپج کے متعلق ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔

نواب قاسم جان

قاسم جان کو نواب معین الملک ناظم پنجاب (عرف میر منو خلف نواب قمرالدین خاں وزیر محمد شاہ بادشاہ[۵۱]) نے سندھ کی جاگیر دی۔ اور نظیر بیگ خاں (ہزارہ) کی صاحبزادی سے شادی کر دی۔ عارف جان کی شادی اٹک کے ناظم مرزا محمد بیگ کی صاحبزادی سے ہوئی۔ تینوں[۵۲] بھائی میر منو کی رفاقت میں سکھوں کے مقابلے میں اپنی شجاعت اور سپہ سالاری کے جوہر دکھاتے رہے۔ نواب معین الملک کے انتقال کے بعد قاسم جان پانچ سو تورانی سوار[۵۳] لے کر بہار پہنچے اور شہزادۂ عالی گہر (شاہ عالم ثانی) کی معیت میں میرن بن میر جعفر کو شکست دی (جو لارڈ کلائیو کی معیت میں شہزادہ سے نبرد آزما تھا) شہزادہ نے ان کو شرف الدولہ سہراب جنگ کا خطاب اور ہفت ہزاری منصب دے کر اپنے رفقا میں داخل کر لیا جب شہزادہ وہاں سے واپس ہوا تو یہ تینوں بھائی[۵۴] دہلی آگئے اور یہیں سکونت اختیار کر لی۔ دہلی

---

۵۱ آب حیات آزاد ص۲۴۳ ۵۲ تاریخ رؤسائے پنجاب ص۱۱۹ ۵۳ غالب از مہر ۵۴ نواب بشیرالدین احمد خاں کے پوتے فرید مرزا بن خسرو مرزا فرماتے ہیں کہ عالم جان نے دہلی میں سکونت اختیار نہیں کی تھی بلکہ پنجاب میں رہے اور ایک نو مسلمہ سکھ عورت سے شادی کی۔

میں گلی قاسم جان انھیں کے نام سے مشہور ہے۔ اس محلہ میں قاسم جان نے حویلی بنوائی تھی جو احاطہ کالے صاحب کہلاتی ہے اور اسی کے قریب ایک مسجد ۱۲۹۳ھ میں بنوائی تھی جو اب نواب احمد سعید خاں کی مسجد کہلاتی ہے[۵۱]۔

یہ حویلی بنیادی بیگم زوجہ نواب غلام حسین خاں مسرور نے حاجی شیخ نصیر الدین صاحب عرف میاں کالے صاحب کی نذر کر دی تھی۔ میاں کالے صاحب مولانا قطب الدین کے صاحبزادے اور مولانا فخر عالم رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے تھے اور آخری مغل بادشاہ ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ کے مرشد تھے۔ احاطہ کالے صاحب دراصل نواب قاسم جان کا محل مشتمل بر حویلی و دیوان خانہ تھا۔ نواب قاسم جان کے پوتے نواب غلام حسین خاں مسرور کی دو بیویاں تھیں۔ ایک بنیادی بیگم تھیں جن کے حصہ میں یہ حویلی آئی تھی اور دوسری بیوی کے حصہ میں خلوت خانہ اور مکان آیا تھا جو اس وقت حمید الرحمن اور حکیم امتیاز الدین کے قبضہ و تصرف میں ہے۔

میاں نظام الدین ابن میاں کالے صاحب لاولد فوت ہوئے ان کی بیوی سعید النسا عرف ننھی بیگم (بنت نواب غلام حسین خاں مسرور) اور میاں نظام الدین کی ہمشیر گان کے درمیان ترکہ پر نزاع ہوا اور یہ حویلی چالیس ہزار روپے میں نیلام ہوئی۔ دس ہزار روپیہ بیوی صاحبہ کو اور باقی روپیہ ہمشیر گان کو ملا۔

میاں نظام الدین صاحب سعید النسا کے دوسرے شوہر تھے۔ ان کے پہلے شوہر کوئی شہزادے تھے جنھوں نے ان کے لئے یہ شعر کہا تھا۔

کرو شاہ کے گھر میں تم حکمرانی   محلدار بیگم امیر الزمانی

یہ گویا ان کو خطاب عطا کیا گیا تھا۔ (بیان نواب خسرو مرزا)

نواب قاسم جان دہلی میں سکونت اختیار کرنے کے بعد معاملات سلطنت میں دخیل رہے۔

---

۵۱ واقعات دار الحکومت دہلی جلد دوم ص ۳۳۳

عالمگیر ثانی کے قتل اور عالی گوہر (شاہ عالم) کی تخت نشینی وغیرہ امور مملکت میں نواب ذوالفقار الدولہ نجف خاں کے دست و بازو رہے اور شاہ عالم کے نائب وزیر کا عہدہ ملا۔

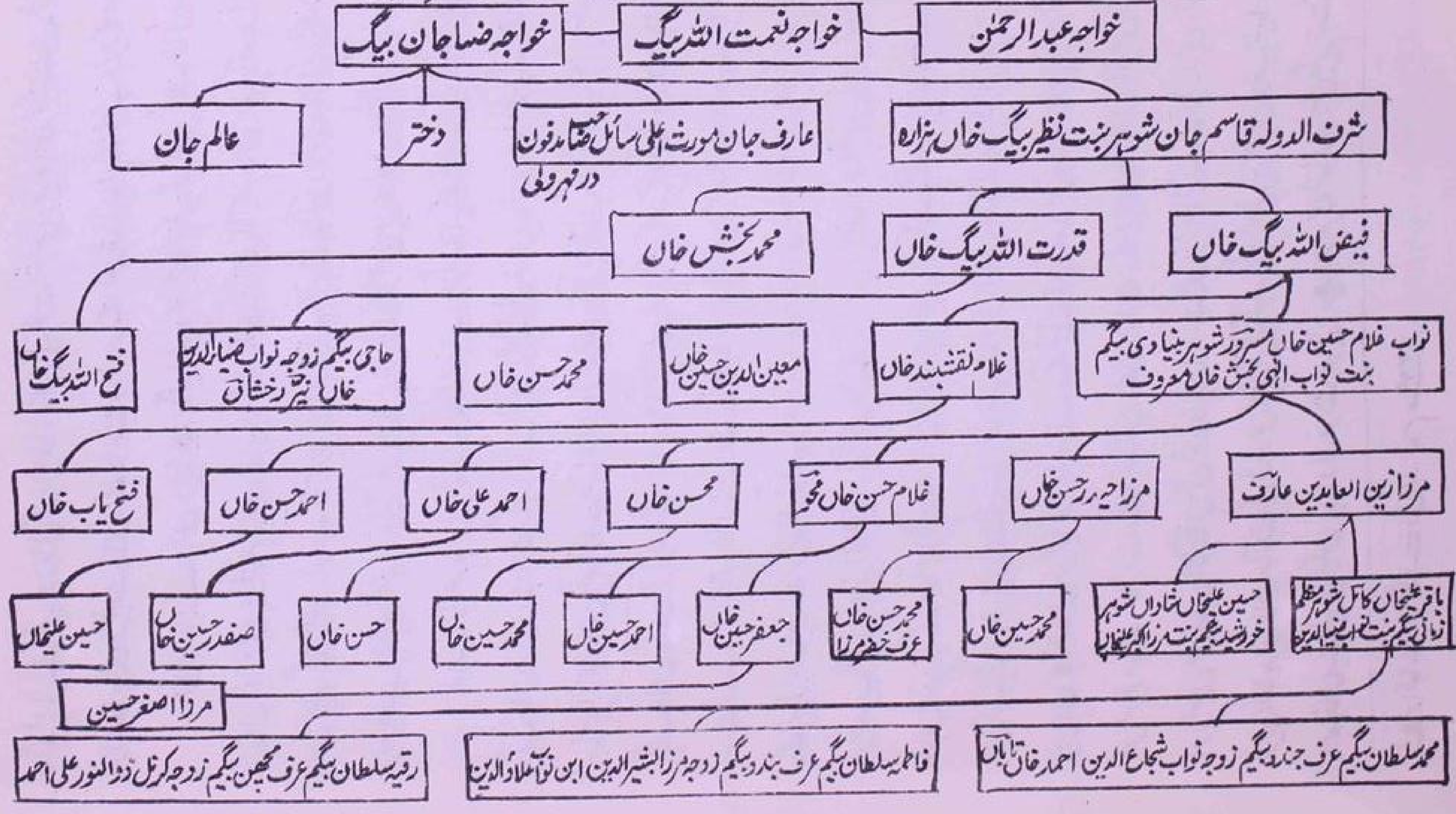
نواب عارف جان دیہات جاگیر وغیرہ کا انتظام کرتے تھے۔ نجف خاں کے انتقال اور دہلی پر غلام قادر روہیلہ کے تسلط کے بعد قاسم جان بعہدِ آصف الدولہ لکھنؤ چلے گئے تھے۔ نواب قاسم جان اور نواب عارف جان دونوں بھائی درگاہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ میں سماع خانے کے صحن میں مدفون ہیں[1]۔

نواب قاسم جان (شرف الدولہ سہراب جنگ) کے تین لڑکے تھے۔ فیض اللہ بیگ خاں، قدرت اللہ بیگ خاں فیروز، محمد بخش خاں۔ قدرت اللہ بیگ خاں کی صاحبزادی حاجی بیگم نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر رخشاں کو منسوب تھیں۔ فیض اللہ بیگ خاں کے دو فرزند تھے نواب غلام حسین خاں مسرور جن کی شادی بنیادی بیگم بنت نواب الٰہی بخش خاں معروف کے ساتھ ہوئی تھی۔ مسرور صاحب مرزا غالب کے ہم زلف ہوئے۔ کیونکہ نواب معروف کی دوسری صاحبزادی امراؤ بیگم مرزا غالب کو منسوب تھیں۔ مرزا غالب نے جس لڑکے کو متبنیٰ کیا تھا وہ انھیں نواب غلام حسین خاں مسرور کے صاحبزادے زین العابدین خاں عارف تھے۔ مرزا صاحب نے ان کو بیٹے کی طرح پرورش کیا اور رجب جمادی الثانی ۱۲۶۸ھ مطابق اپریل ۱۸۵۲ء میں ان کا انتقال ہو گیا تو مرزا غالب نے نہایت پُر درد مرثیہ لکھا جو دیوان غالب میں موجود ہے۔ عارف کے انتقال کے بعد ان کے دونوں لڑکوں باقر علی خاں کامل اور حسین علی خاں شاداں کی غور و پرداخت بھی مرزا غالب کے ذمہ رہی۔ نواب زین العابدین خاں عارف کی شادی پہلی مرتبہ نواب بیگم ہمشیرۂ حقیقی نواب ضیاء الدین احمد خاں سے ہوئی لیکن یہ لاولد فوت ہوئیں۔ پھر دوسری شادی لبستی بیگم بنت سالار

---

[1] واقعات دارالحکومت دہلی جلد دوم صفحہ ۲۶۹

از یادداشت مخطوطہ مرزا بشیر الدین احمد خان (بشکریہ نواب خسرو مرزا)



مرزا محمد علی بیگ کے ساتھ ہوئی اُن سے باقر علی خاں کامل اور حسین علی خاں شاداں پیدا ہوئے۔ باقر علی خاں کامل کی شادی نواب ضیاء الدین احمد خاں کی صاحبزادی معظم زمانی بیگم (عرف بگا بیگم) کے ساتھ ہوئی۔ ان کی صرف تین لڑکیاں تھیں۔ محمد سلطان بیگم (عرف جندو بیگم) فاطمہ سلطان بیگم (عرف بندو بیگم) رقیہ سلطان بیگم (عرف مچھن بیگم) جندو بیگم مرزا شجاع الدین احمد خاں تاباں کو منسوب تھیں۔ بندو بیگم مرزا بشیر الدین بن نواب علاؤ الدین والئ لوہارو کو منسوب تھیں۔ مچھن بیگم ڈاکٹر ذوالنور علی احمد آسامی عرف کرنل زیڈ احمد کو منسوب ہوئیں۔ موجودہ صدر جمہوریہ ہند عالی جناب معلی القاب فخر الدین علی احمد انھیں ڈاکٹر کرنل زیڈ احمد کے فرزند ارجمند ہیں۔ راقم الحروف مع اصف، خالہ جان مرحومہ (مچھن بیگم) کی خدمت میں بارہا حاضر ہوا ہے۔ اللہ اللہ! ایک دو خوبیاں ہوں تو ضبطِ تحریر میں لاؤں۔ اب ایسی ہستیاں ناپید اور نایاب ہو چکیں اور وہ معادن اُجڑ چکے جہاں سے ایسے لعل و جواہر دستیاب ہوتے تھے۔ سراپا رافت و شفقت، سراپا اخلاق و تہذیب، سراپا محبت و اخلاص، سراپا صلاح و تقویٰ، سراپا ہمدردی و غمگساری، سراپا فصاحت و بلاغت، سراپا حسن و جمال، غرضیکہ قلم آں عفیفۂ مہربان کے اوصاف لکھنے سے عاجز ہے۔

اخبار الجمعیۃ دہلی مجاہدِ ملت نمبر مورخہ ۱۵ مارچ ۱۹۶۳ء صفحہ ۱۹۷ پر مولوی مقبول احمد سیوہاروی نے اپنے مقالہ میں ایک دلچسپ واقعہ لکھا ہے۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ:۔

تحریکِ خلافت کے زمانے میں مولانا حفظ الرحمان سیوہاروی، مولانا بشیر احمد بھٹہ، مولوی مقبول احمد سیوہاروی وغیرہ تقریباً پندرہ سولہ ساتھی بجنور جیل میں رکھے گئے تھے۔ جیل کے سپرنٹنڈنٹ کرنل زیڈ احمد صاحب تھے۔ مزاج کے سخت تھے۔ ہم سب سیاسی قیدیوں نے ایک موقع پر احتجاجاً کھانے کی ہڑتال کر دی اور ہمارے

اس اقدام نے جیل کے قیدیوں میں بغاوت کی روح پھونک دی۔ ہمارے وارڈ کے قریب پنڈت دیورتن شرما جنرل سکریٹری آل انڈیا ہندو مہا سبھا پہلے سے جیل یاترا کے لئے آچکے تھے ہم سے اتنے قریب تھے کہ جنگلے کے دروازے سے جھانک کر باتیں کر لیتے تھے، انھوں نے بھی کھانا چھوڑ دیا اور ہم سے کہا جب تک سپرنٹنڈنٹ معافی نہ مانگے ہرگز کھانا نہ کھانا۔

زبیڈا احمد صاحب کی بیوی دلّی کے خاندان کی ایک شریف خاتون تھیں۔ زبیڈا احمد صاحب اُن سے بہت متاثر تھے۔ انھوں نے جب سُنا کہ خلافت کے مولویوں نے کھانا چھوڑ دیا ہے تو خود بھی کھانا چھوڑ دیا۔

ہماری بھوک کا کتنا اثر ہوا یہ تو ہم جانتے نہیں مگر بیگم صاحبہ کا حربہ کارگر ہوا۔ بیگم صاحبہ نے کہا۔ جب تک مولویوں سے معافی نہ مانگو گے میں ہرگز کھانا نہ کھاؤں گی اور کئی قسم کے کھانے پکا کر شوہر کو دیئے کہ ابھی جاؤ میرا سلام کہو اور معافی مانگ کر کھانا کھلاؤ۔

زبیڈا احمد صاحب بیگم صاحبہ کی خفگی کی تاب نہ لا سکے اور جیل میں آکر ہم سب سے کُھلے لفظوں میں معافی مانگی اور ہم نے کھانا کھا لیا۔ (اس جرأتمندانہ غمگساری و ایثار کی مثال اب کہیں نہ ملے گی)

عارف کے دوسرے صاحبزادے حسین علی خاں شاداں کی شادی خورشید بیگم (بنت مرزا اکبر علی خاں بن حسن علی خاں بن نبی بخش خاں بن عارف جان) کے ساتھ ہوئی تھی۔[۱]

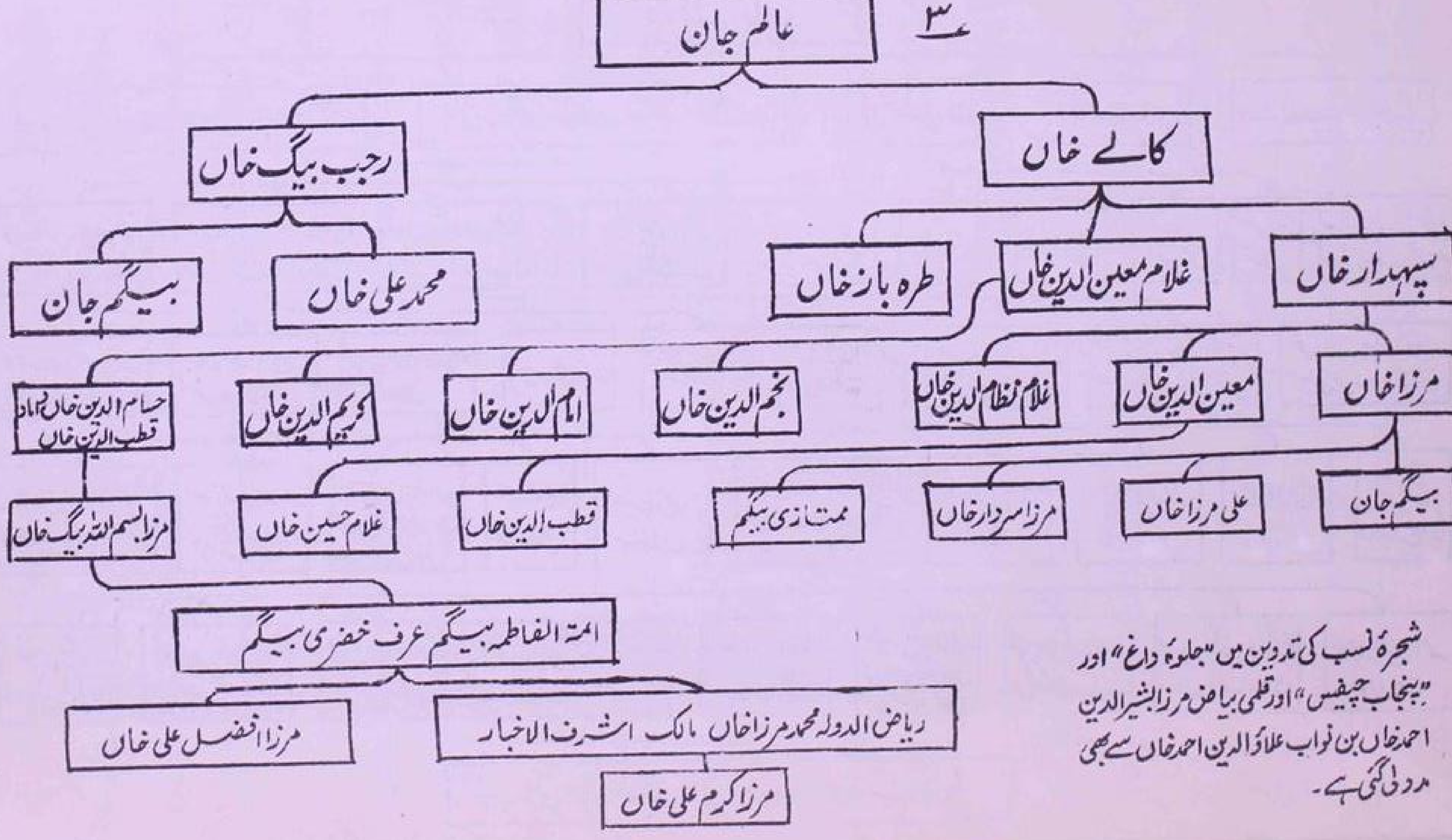
نواب عارف جان

عارف جان کے چار بیٹے تھے۔ الٰہی بخش خاں معروف، احمد بخش خاں نبی بخش خاں

---

[۱] مکاتیب غالب از عرشی ص ۹۵ و ۹۶


عارف جان
۲
نواب الٰہی بخش خاں معروف وفات ۱۲۴۲ھ
نواب احمد بخش خاں وفات ۱۲۴۳ھ
نبی بخش خاں
مرزا محمد علی خاں
دختر۔ زوجہ مرزا نصراللہ بیگ
نواب شمس الدین شوہر دختر مغل بیگ بیگ بخشی
نواب امین الدین احمد خاں متوفی ۱۲۸۶ھ مدفون کبرولی
نواب ضیاء الدین احمد شوہر حاجی بیگم بنت قدرت اللہ
ابراہیم علی خاں متوفی ۱۸۳۰ء
نواب بیگم زوجہ عارف
صاحب خانم
سلطان بخش
پسر نامعلوم الاسم
حسن علی خاں
مرزا اکبر علی خاں شوہر صاحب خانم بنت بہمن بیگ
محمد النساء یا شمس النساء زوجہ سعادت علی خاں
احمد النساء زوجہ غوث محمد خاں
نواب علاؤ الدین احمد علائی
حسین علی خاں
عبدالمجید خاں
شہاب الدین احمد خاں ثاقب
سعید الدین احمد خاں طالب عرف احمد سعید خاں
معظم زمانی بیگم عرف بگا بیگم زوجہ باقر علی خاں کامل
خورشید بیگم زوجہ حسین علی خاں شاداں
سر امیر الدین احمد خاں عرف فرخ مرزا شوہر اختری بیگم
ضمیر الدین احمد خاں عرف ضمیر مرزا
بشیر الدین احمد خاں شوہر بلند بیگم بنت باقر علی خاں کامل
عزیز الدین احمد خاں
نصیر الدین احمد خاں
شجاع الدین تاباں شوہر محمد سلطان بنت باقر علی خاں کامل
بہاء الدین احمد خاں طلب
سراج الدین احمد خاں سائل
ممتاز الدین احمد خاں آئل
اختری بیگم زوجہ فرخ مرزا
فخری بیگم زوجہ نواب ٹنگرول
معز الدین اکبر مرزا ولادت ۱۸۶۵ء وفات ۱۹۰۰ء
نواب اعزاز الدین احمد اعظم میاں ولادت ۱۸۶۵ء وفات ۱۹۲۶ء شوہر فخر سلطان بیگم بنت نواب بشیر الدین
اعزاز الدین احمد خاں شاہرخ مرزا ولادت ۱۸۶۷ء
بلقیس بیگم زوجہ نواب احمد نواز خاں دیرہ اسمٰعیل خاں
شہربانو بیگم زوجہ ابراہیم علیخاں نواب پاٹودی
مہربانو بیگم زوجہ قطب الدین خاں نواب ممدوٹ
اعتزاز الدین احمد ہمایوں مرزا
نواب امین الدین احمد خاں ثانی موجودہ و آخری نواب لوہارو



شجرۂ نسب کی تدوین میں "جلوۂ داغ" اور "پنجاب چیفس" اور قلمی بیاض مرزا بشیر الدین احمد خاں بن نواب علاؤ الدین احمد خاں سے بھی مدد لی گئی ہے۔

محمد علی خاں اور ایک لڑکی تھی جو مرزا غالب کے چچا مرزا نصراللہ بیگ کو منسوب تھی۔

نواب الٰہی بخش خاں معروف

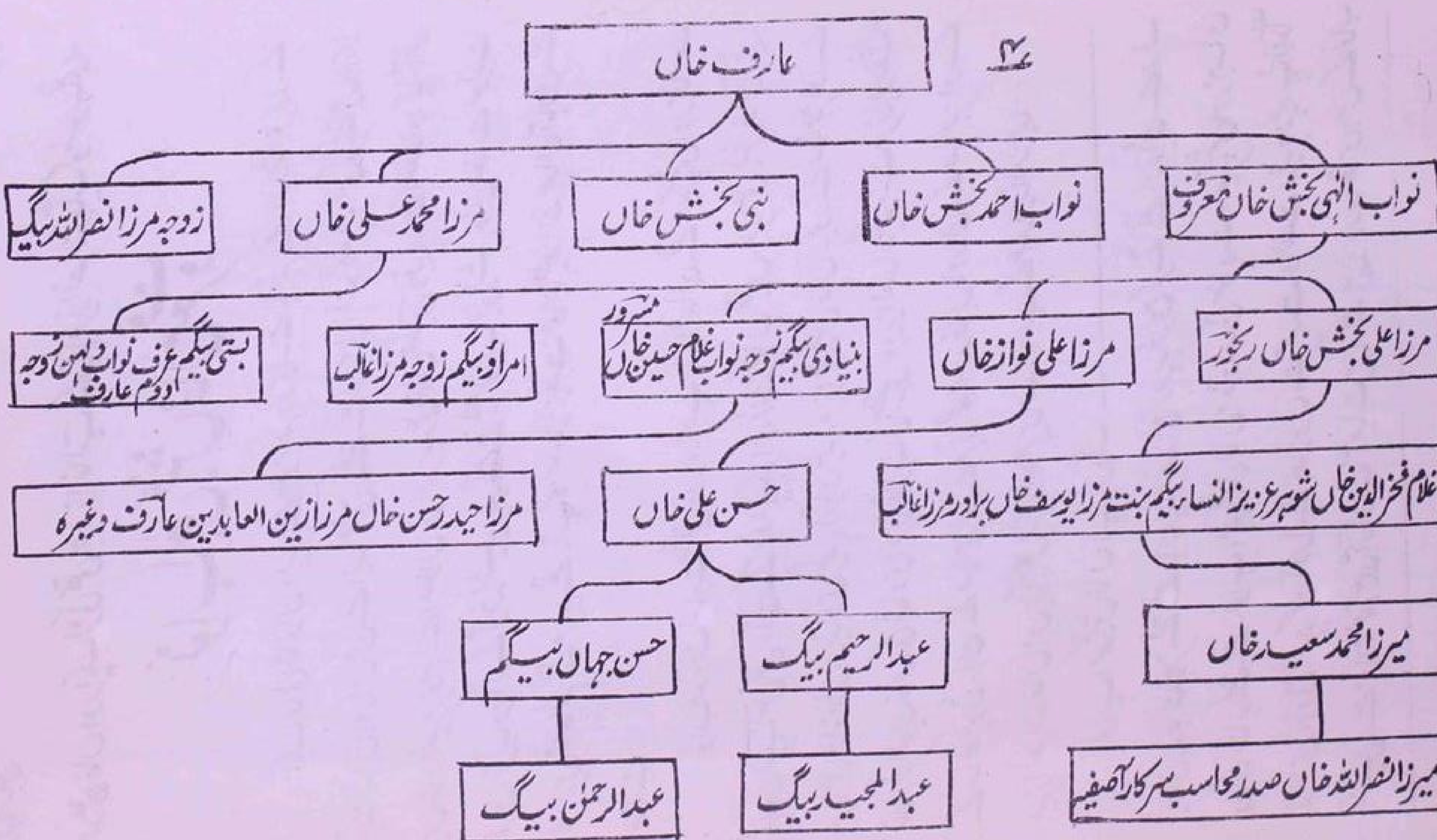
ایک عالی خاندان امیر تھے علوم ضروری سے باخبر تھے اور شاعری کے کہنہ مشاق اور اس فن سے ایسا عشق رکھتے تھے کہ فنا فی الشعر کا مرتبہ اسی کو کہتے ہیں ابتدا میں شاہ نصیر مرحوم سے اصلاح لی اور سید علی خاں غمگین وغیرہ سے استفادہ کیا۔ آخر عمر میں ترکِ دنیا کر کے گوشہ نشین ہو گئے تھے[1] نواب الٰہی بخش خاں حضرت مولینا فخرالدین فخر عالم کے مرید تھے۔ آپ کا سلسلۂ بیعت خواجہ کلیم اللہ جہان آبادی سے ملتا ہے۔

نواب معروف نہایت متقی اور صاحب دل انسان تھے۔ سیر چشمی اور سخاوت ان کی ضرب المثل تھی۔ اُن کے دو لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں۔ مرزا علی بخش خاں رنجور، مرزا علی نواز خاں، بنیادی بیگم، امراؤ بیگم۔ مرزا علی بخش خاں رنجور کے صاحبزادے غلام فخرالدین خاں کی شادی مرزا غالب کی بھتیجی عزیزالنساء بیگم بنت مرزا یوسف خاں کے ساتھ ہوئی۔ ان کے صاحبزادے مرزا محمد سعید خاں اور ان کے صاحبزادے میرزا نصراللہ خاں ہیں جو آجکل سرکار نظام میں صدر محاسب کے عہدہ پر فائز ہیں۔

نواب احمد بخش خاں اپنے بزرگ ———— بھائی پر جان چھڑکتے تھے۔ ان پر بیدریغ روپیہ خرچ کرتے تھے اور ان سے صرف دعا کی تمنّا رکھتے تھے۔ نواب الٰہی بخش خاں معروف کی سخاوت، سیر چشمی اور مہمان نوازی، ذوقِ شعر و سخن اور اپنے بھائیوں سے محبت و الفت وغیرہ دلچسپ واقعات تفصیل سے مولانا محمد حسین آزاد نے آبحیات میں لکھے ہیں اور ساتھ ہی اس کے نواب

---

[1] آب حیات آزاد صفحہ ۴۴۴


عارف خاں
نواب الہٰی بخش خاں معروف
نواب احمد بخش خاں
نبی بخش خاں
مرزا محمد علی خاں
زوجہ مرزا نصر اللہ بیگ
مرزا علی بخش خاں رنجور
مرزا علی نواز خاں
بنیادی بیگم زوجہ نواب غلام حسین خاں مسرور
امراؤ بیگم زوجہ مرزا غالب
بستی بیگم عرف نواب دلہن زوجہ اودم عارف
غلام فخر الدین خاں شوہر عزیز النساء بیگم بنت مرزا یوسف خاں برادر مرزا غالب
حسن علی خاں
مرزا حیدر حسن خاں مرزا زین العابدین عارف وغیرہ
میرزا محمد سعید خاں
عبد الرحیم بیگ
حسن جہاں بیگم
میرزا نصر اللہ خاں صدر محاسب سرکار آصفیہ
عبد المجید بیگ
عبد الرحمن بیگ

صاحب کا استاد ذوق سے اپنی غزلوں کی اصلاح کرانا اور استاد ذوق کا اُن کے دیوان خانہ پر حاضر ہو کر ان کی غزلیں "بنانے" کو اپنا معمول بنا لینا وغیرہ عجیب و غریب انداز میں مزے لے لے کر لکھا ہے۔

مولانا محمد حسین آزاد کو ایک اچھا انشا پرداز تو کہا جا سکتا ہے مگر فن تاریخ میں ان کی کوئی حیثیت نہیں۔ انھوں نے مورخ بننے کی کوشش کی اور اس میں ناکام رہے۔ فن تاریخ میں بڑی عالی ظرفی، دیانت، وسیع النظری اور تحقیق و جستجو کی ضرورت ہے۔ حکیم مومن خاں جیسے اہلِ کمال اور مایۂ ناز شاعر کی جو انھوں نے تحقیر کی ہے اور اس کے حق میں انھوں نے جو بے انصافی کی ہے اس کو اردو ادب کی اور ہماری ثقافت کی تاریخ کبھی معاف نہیں کر سکتی۔

آزاد کے مرتّب کیے ہوئے دیوان ذوق کے حواشی اور اُن کی تصنیف آبحیات کو پڑھنے کے بعد ایک خالی الذہن طالب علم یہ اثر لیتا ہے کہ سراج الدین ظفر بہادر شاہ کے اندر نہ تو شعر کہنے کی صلاحیت تھی نہ سخن فہمی کی اور یہ بے پناہ ذخیرہ یعنی چار بڑے بڑے دیوان ان کو دوسروں نے کہہ کر دیئے ہیں۔ حالانکہ ظفر کی زبان اور اسلوبِ نگارش و انداز بیان اور ہے اور ذوق کا رنگ جُدا۔

ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ اُستادی شاگردی تو ایک رسمی چیز تھی۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ شاہی درباروں میں جہاں علماء و فضلاء و اربابِ ہنر کا اجتماع ہوتا تھا وہاں شعرا بھی اپنے کمالات دکھاتے تھے اور مدحیہ قصائد لکھ کر انعام پاتے تھے۔ یہ چیزیں دربار کے لوازمات اور اربابِ علم و ہنر کے وسائل قدر دانی میں سے تھیں۔

نواب معروف کی شاگردی کا افسانہ بھی آزاد کے اختراعی افسانوں میں سے ہے۔ ایک طرف تو استاد ذوق کی عظمت یہ ہے کہ نو عمری ہی میں خاقانی ہند ہو جاتے ہیں اور جاہ و جلال کا یہ عالم ہے کہ مرزا غالب جیسا تمکنت والا صاحب کمال بھی اُن

سے لرزتا ہے اور ولی عہد (جواں بخت) کے سہرے کے بعد قطعہ معذرت لکھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ دوسری طرف ان کی حیثیت اور مستقل مشغلہ یہ دکھاتے ہیں کہ وہ لوگوں کے گھروں پر جا جا کر غزلیں بناتے پھرتے ہیں۔ یہ ہجو ملیح نواب صاحب کی ہے یا استاد ذوق کی؟

خمخانہ جاوید جلد سوم صفحہ ۲۷ (ذوق کے تذکرہ میں) لکھا ہے:۔

"مولانا محمد حسین آزاد نے جوش عقیدت مندی میں آبحیات میں لکھا ہے کہ نواب الٰہی بخش خاں معروف جو شاہ نصیر کے پرانے شاگرد تھے اور اس وقت چھیاسٹھ سال ان کی عمر تھی انھوں نے حضرت ذوق کو جو بمشکل اٹھارہ سال کے تھے اپنا استاد بنایا۔ اس حکایت کی تکذیب نواب ضیاء الدین احمد خاں اور نواب سعید الدین احمد خاں طالب نے خود مولانا آزاد سے مباحثہ کر کے بہ براہین قاطع کر دی تھی مگر افسوس کہ مولانا نے اقرار کر لینے کے باوجود طبع ثانی میں اس بیان کی تردید نہ کی۔ بلکہ جب کئی برس کے بعد دیوان ذوق خود شائع کیا تو اس میں فخریہ اسی عبارت کو نقل کر دیا۔" (ملخصاً و ملتقطاً)

گویا نواب معروف کو چھیاسٹھ سال کی عمر میں بھی زانوئے ادب تہ کرنے اصلاح لینے اور غزلیں خریدنے کی ضرورت تھی۔ بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست۔

صاحب خمخانہ نے اس کو جوشِ عقیدت مندی سے تعبیر کیا ہے۔ لیکن مولانا آزاد نے شاہ نصیر سے استاد ذوق کی جو معرکہ آرائیاں دکھائی ہیں اُن سے تو استاد ذوق کی شان کو بٹہ لگتا ہے۔

اول تو شاہ نصیر ظفر بہادر شاہ کے بھی استاد تھے اور ذوق کے بھی اُستاد تھے۔ پس ظفر اور ذوق دونوں معاصر تھے۔ ولی عہد کے اولین اُستاد سے ذوق بھڑ جاتے ہیں لیکن ولی عہد کو کوئی تکدر نہیں ہوتا۔

دوسرے یہ کہ آج اخلاقی گراوٹ اور خود رائی کے زمانے میں بھی جبکہ اُستادی شاگردی کے قدیم رکھ رکھاؤ اور آداب و مراسم فنا ہو چکے ہیں کوئی شاگرد اپنے نالائق اُستاد سے کتنا ہی برگشتہ ہو جائے لیکن مقابلہ میں نہیں آتا۔ جانتا ہے کہ لوگ مجھی کو ناخلف شاگرد کہیں گے۔

بابائے اُردو مولوی عبدالحق نے مولانا حالی پر ایک مقالہ لکھا ہے اس میں جو واقعات لکھے ہیں ان سے مولانا آزاد کی افتادِ طبع کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ لکھتے ہیں کہ:-

"آزاد مرحوم تو اُن کا (حالی کا) نام تک سننے کے روادار نہ تھے۔ اس معاملہ میں ان کی طبیعت کا رنگ بعینہ ایسا تھا جیسے کسی سوت کا ہوتا ہے۔ لاہور میں کرنل ہالرائڈ کی زیرِ ہدایت جو جدید رنگ کے مشاعرے ہوتے ان میں دونوں نے طبع آزمائی کی۔ برکھا رُت، حُبِ وطن، نشاطِ اُمید اسی زمانے کی نظمیں ہیں۔ مولانا کی ان نظموں کی جو تعریف ہوئی تو یہ امر حضرت آزاد کی طبع نازک پر گراں گزرا۔ اس وقت سے اُن کا رُخ ایسا پھرا کہ آخر دم تک یہ پھانس نہ نکلی۔

آزاد اپنے رنگ کے بے مثل نثار تھے مگر شعر کے کوچہ میں ان کا قدم نہیں اُٹھتا لیکن مولانا حالی کی انصاف پسندی ملاحظہ کیجئے کیسے صاف لفظوں میں اس نئی تحریک کا سہرا آزاد کے سر باندھتے ہیں۔"

(شعر کے کوچے میں تو اُن کا قدم نہیں اُٹھتا لیکن تاریخ کے میدان میں قدم اُٹھانے سے پہلے گر پڑتے ہیں۔ (واصف)

لہ اس وقت ہمارے سامنے دیوان ذوق مرتبہ آزاد شائع کردہ بنت آغا محمد ابراہیم صاحب مرحوم منصف لاہور موجود ہے۔ یہ ۱۹۳۳ء میں علمی پرنٹنگ ورکس دہلی میں چھپا تھا۔ اس کے صفحہ ۱۵ سطر ۶ میں ملاحظہ ہو "میر نجات کی گم گشتی ہم نے لکھی ہوئی تھی" پھر آگے صفحہ ۳۰ سطر ۱۶ میں ملاحظہ ہو "استاد نے ہنس دیا"، کیا یہ ٹکسالی اردو ہے؟ شاید کاتب نے تصرف کیا ہو۔ واصف۔

برانگیختم گرد ہیجا چو دود　　　چو دولت نباشد تہور چہ سود

افسوس! مولانا محمد باقر جیسے مجاہد شہید کا خلف رشید اور جادۂ اعتدال سے اس قدر منحرف؟ (مولانا محمد باقر کے حالات "اردو کے اخبار نویس" ص۱۴۴ مؤلفہ مولانا امداد صابری میں دیکھو)

تاج اتر چکا تھا۔ تخت چھن چکا تھا۔ اولیائے نعمت تبدیل ہو چکے تھے۔ اب تو شاہانِ سلف اور بزرگانِ رفتہ کے اندر نہ کوئی علمی قابلیت تھی نہ عدل وانصاف تھا۔ نہ اور کوئی خوبی تھی۔ بس عیوب ہی عیوب تھے۔ اُدھر پردیسیوں نے ہزاروں کیڑے ڈالے۔ اِدھر ابنائے وطن نے بھی عیب ہی عیب نکالے اور خوب اچھالے۔

یہ سب لوگ مجاہدین میں سے تھے جن کی تحقیر کی گئی ہے۔ حکیم مومن خاں کا تعلق مولانا سید احمد شہید بریلوی کی تحریکِ جہاد سے تھا۔ بہادر شاہ ظفر جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے ہیرو تھے۔ نواب الٰہی بخش خاں معروف بچچا تھے نواب شمس الدین احمد خاں کے جن کو انگریز دشمنی کی سزا (پھانسی) دی گئی تھی۔ (دیکھو قتل ولیم فریزر مرتبہ نواب خسرو مرزا ص۲۱ اور اردو کے اخبار نویس مولفہ مولانا امداد صابری ص۲۰ اور مثنوی انبساط وانتشار مصنفہ میجر نواب امین الدین احمد خاں)

نبی بخش خاں

نبی بخش خاں کی ایک بیٹی صاحب خانم اور تین لڑکے سلطان بخش خاں، حسن علی خاں وغیرہ تھے۔ حسن علی خاں کے بیٹے مرزا اکبر علی خاں کی شادی صاحب خانم بنت مرزا انجمن بیگ صوبیدار سے ہوئی جن کے بطن سے خورشید بیگم پیدا ہوئیں اور انھیں خورشید بیگم کا دوسرا نام حسن جہاں بیگم ہے۔ مرزا غالب نے حسین علی خاں شاداں کے ساتھ انھیں کی نسبت قرار پانے کا ذکر کیا ہے[۱]

---

[۱] مکاتیب غالب از عرشی ص۹۵و۹۶

عام طور پر تذکروں میں مذکور ہے کہ مرزا اکبر علی خاں نے جنرل ڈیوڈ اختر لونی کی لڑکی سے نکاح کیا تھا اور اس سلسلہ میں مسٹر مالک رام مصنف "ذکر غالب" اور مولانا غلام رسول مہر مصنف غالب کو بھی غلط فہمی ہوئی ہے اور افسوس کہ راقم الحروف کو بھی مغالطہ ہوا تھا۔ خدا بھلا کرے نواب ناصر الدین خسرو مرزا اور مرزا افراسیاب بیگ کا کہ ان ہر دو بزرگوں نے اس مشکل کو حل کیا اور پرانی دستاویزات مجھے دکھائیں۔ میں ان ہر دو حضرات کی شکر گزاری کے بعد اس تحقیق کا نتیجہ عرض کرتا ہوں:۔

جنرل ڈیوڈ اختر لونی جو ایک یورپین جنرل تھا اس کی بیوی مبارک النسا بیگم تھی اس کے بطن سے دو لڑکیاں پیدا ہوئی تھیں جو انگریزی قانون کی بنا پر ولایت بھیج دی گئیں۔ پھر مبارک النسا بیگم نے مرزا جھمن بیگ رسالدار کی بیٹی صاحب خانم کو بیٹی بنا لیا۔ یہ مرزا جھمن بیگ جنرل اختر لونی کی فوج میں صوبیدار تھے۔ انھیں صاحب خانم کی شادی مرزا اکبر علی خاں بن حسن علی خاں کے ساتھ ہوئی۔ ان کا کابین نامہ مرزا افراسیاب بیگ کے ہاں موجود ہے۔ یہ نکاح ۱۴ ربیع الاول ۱۲۶۴ھ مطابق ۲۰ فروری ۱۸۴۸ء میں ہوا۔ عام تذکروں میں جو مذکور ہے کہ مرزا اکبر علی خاں نے جنرل ڈیوڈ اختر لونی کی لڑکی سے نکاح کیا تھا وہ یہی صاحب خانم بنت مرزا جھمن بیگ صوبیدار ہیں۔ جن کو اختر لونی کی بیوی (یاداشتہ) مبارک النسا بیگم نے بیٹی بنا لیا تھا۔ صاحب خانم کے بطن سے خورشید بیگم پیدا ہوئیں۔ یہ مرزا اکبر علی خاں کی ایک ہی اولاد تھیں۔ خورشید بیگم کا پہلا نکاح نواب حسین علی خاں شاداں بن عارف کے ساتھ ۲۹ ذی قعدہ ۱۲۸۶ھ مطابق ۳ مارچ ۱۸۷۰ء کو ہوا۔ ان کا کابین نامہ بھی مرزا افراسیاب بیگ کے پاس موجود ہے۔ اس پر بطور شاہدین محفلِ نکاح کے مندرجۂ ذیل حضرات کے دستخط ہیں۔

باقر علی خاں۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں۔ احمد علی خاں۔ محمد علی۔ نواب قاسم علی خاں۔ سعید الدین وغیرہ۔ اس سے معلوم ہوا کہ مرزا غالب نے جو شاداں کے ساتھ حسن جہاں بیگم

کی نسبت قرار پانے کا ذکر کیا ہے وہ یہی خورشید بیگم بنت مرزا اکبر علی خاں ہیں۔ مرزا نے ان کو نواب احمد بخش خاں کے بھائی کی پوتی بتایا ہے حالانکہ یہ پوتے کی بیٹی تھیں۔ پڑپوتی کو پوتی کہنا تو عُرف کے خلاف نہیں ہے لیکن نام کا فرق کیوں ہے۔ یہ سوال ابھی حل طلب ہے۔ اس کی کئی توجیہیں ہوسکتی ہیں۔ یا تو مرزا غالب کو سہو ہوا اور آخر عمر میں ضعفِ دماغ کی وجہ سے ایسا ہونا ممکن ہے۔ یا از خود یہ خطاب تجویز کر لیا ہو جیسا کہ قدیم زمانہ سے دہلی کے خاندانوں میں یہ دستور چلا آتا ہے کہ دُلہن کو سسرال میں خطاب عطا کیا جاتا ہے اور نام کے بجائے اُسی خطاب سے اُسے پکارا جاتا ہے۔ یا بعض خاندانوں میں عورت کے نام کو ظاہر کرنا معیوب سمجھا جاتا ہے اس لیے قصداً مرزا غالب نے اصل نام کا اخفا کیا ہو۔ اور مصنوعی نام لکھ دیا ہو۔ اور یہی قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس خاندان کے بزرگوں سے اُن کا خطاب (حسن جہاں بیگم) بھی سننے میں نہیں آیا۔ بلکہ یہ حضرات فرماتے ہیں کہ ہم تو ان کا نام صرف خورشید بیگم جانتے ہیں۔

نواب حسین علی خاں کے انتقال کے بعد خورشید بیگم کا نکاح ثانی مرزا شہباد بیگ وکیل ریاست پٹیالہ کے صاحبزادے مرزا سہراب بیگ کے ساتھ ہوا۔ اور یہ مرزا افراسیاب بیگ انھیں کے صاحبزادے ہیں۔ پہاڑی املی پر دولت خانہ ہے۔ میں آپ کے ہونہار صاحبزادے نسیم مرزا کا بھی ممنون ہوں کہ انھوں نے مجھے یہ کابین نامے وغیرہ دکھائے۔

یہ پُرانی دستاویزات میں مبارک النساء بیگم کے نام کے ساتھ نواب کا خطاب بھی لکھا جاتا تھا۔ یہ اگرچہ جنرل اختر لونی کی داشتہ تھیں لیکن شاہی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ حویلی مبارک النسا بیگم عین اس جگہ واقع تھی جہاں اب تھانہ حوض قاضی بنا ہوا ہے۔ تھانہ کے برابر میں انھیں کی بنوائی ہوئی لال مسجد موجود ہے۔ سبزی منڈی باغ محلدار خاں سے آگے کچھ فاصلے پر مبارک باغ جو مشہور ہے وہ انھیں کا تھا۔

تذکروں میں مرزا اکبر علی خاں کے والد کا نام بھی مذکور نہیں تھا۔ آخر بڑی جستجو کے بعد ایک شجرۂ نسب مل گیا جس سے میں نے شجرہ ۲ کی اصلاح کی۔ یہ شجرہ محمد میر خاں نبیرہ نواب محمد خاں والی فرخ نگر کا مرتب کیا ہوا ہے اور نواب خسرو مرزا کے پاس موجود ہے۔

نواب احمد بخش خاں

عارف جان کے دوسرے صاحبزادے نواب احمد بخش خاں نہایت اچھے جرنیل تھے۔ چند سال مرہٹوں کی خدمت کرنے کے بعد راؤ راجہ بختاور سنگھ والیٔ الور سے اپنی عقیدت ظاہر کی جنھوں نے ان کو بطور معتمد لارڈ لیک کے پاس بھیجا یہ کمانڈر انچیف کے ساتھ بہت سی مہموں میں رہے۔ سر ولیم فریزر ریزیڈنٹ دہلی کے ساتھ ان کے دوستانہ مراسم تھے۔ ان کی عام خدمات اور خصوصاً اس کارگزاری کے باعث جو انھوں نے اس عہدنامے کے بارے میں کی تھی جو گورنمنٹ انگریزی اور راجہ الور کے ساتھ ہوا ان کو ضلع گوڑگانوہ کے چھ محال فیروزپور جھرکہ، پونا ہانا، سانکرہ، بچھور، نگینہ اور لوہارو بطور دوام جاگیر میں ملے۔ اس جاگیر کی جس کی آمدنی تین لاکھ روپے سالانہ تھی گورنمنٹ ہند نے باضابطہ منظور کر لیا اور نواب احمد بخش خاں کو فخر الدولہ دلاور الملک رستم جنگ کا خطاب عطا فرمایا[1]۔ نواب موصوف نے ۱۲۴۳ھ میں فیروزپور جھرکہ میں جو مسجد بنوائی تھی وہ اب بھی موجود ہے اس مسجد کے حوض کی مکرر تعمیر ۱۳۶۶ھ میں آخری نواب لوہارو امین الدین احمد خاں ثانی کے اہتمام سے ہوئی۔ اس کا قطعۂ تاریخ راقم الحروف واصف نے کہا:۔

قطعۂ تاریخ تعمیر حوض جامع مسجد فیروزپور جھرکا

امین الدین احمد خان ثانی   مہے از آل احمد بخش خانی

---

[1] تاریخ رؤسائے پنجاب صہ ۱۱۹

رئیس و حکم فرمائے لُہارو ملاذ خلق و ملجائے امانی
امیر خوش گہر فرخ نژادے اعز عصر و فخر دودمانی
بہ ایمایش شد ایں حوضِ عنفے خجستہ یادگارِ جاودانی
منور با صفائے آب پاکش ز سطحش تا فضائے آسمانی
بہ صحن مسجد ایں حوض مطہر چو از تسنیم جامِ اقحوانی
بہ واصف دہلوی تلمیذِ سائل رسیدہ فال یمن و شادمانی
ہزار و سہ صد و شصت آمد و شش (۱۳۶۶ھ)
ز ہجرت تا بہ نظمِ ایں معانی

خواصوں کے علاوہ نواب احمد بخش خاں کی دو بیگمیں تھیں ایک میواتی الاصل جس کا نام مدی خانم عرف بہو بیگم تھا۔ اس کے بطن سے بڑے صاحبزادے نواب شمس الدین احمد خاں اور دوسرے صاحبزادے ابراہیم علی خاں (المتوفی ۱۸۳۲ء) اور ایک بیٹی نواب بیگم تھیں (جو زین العابدین عارف کو منسوب تھیں) اور دوسری بیگم اُن کے اپنے خاندان کی تھی اس کا نام بیگم جان تھا (یہ غالباً نواب احمد بخش خاں کی چچا زاد بہن تھی) ان کے بطن سے نواب امین الدین احمد خاں اور نواب ضیاء الدین احمد خاں تھے۔

نواب موصوف نے ۱۸۲۲ء میں بڑے صاحبزادے نواب شمس الدین احمد خاں کو اپنا جانشین قرار دیا۔ چونکہ وہ میواتی بیگم کے بطن سے تھے اور خاندان کے دوسرے افراد جن میں غالب بھی شامل تھے انھیں نسباً اپنا ہم پایہ نہیں گردانتے تھے اس وجہ سے خاندان میں کشیدگی پیدا ہو گئی۔ شمس الدین احمد خاں ایک طرف تھے اور باقی سارا خاندان دوسری طرف تھا۔

معاملے کی نزاکت کو محسوس کر کے نواب احمد بخش نے ۱۸۲۶ء میں فیروزپور جھرکہ کی مسند شمس الدین احمد خاں کو دے کر لوہارو سے دست برداری کا اقرار نامہ لکھوا لیا۔ اور لوہارو کی جاگیر امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں کو سونپ کر اپنی خاندانی حویلی واقع مہرولی میں گوشہ نشین ہو گئے۔ اکتوبر ۱۸۲۷ء (۱۲۴۳ھ) میں وفات پائی اور اپنے پیر و مرشد مولانا فخر الدین اورنگ آبادی کے مزار کے پاس دفن ہوئے۔

نواب شمس الدین احمد خاں

نواب کے انتقال کے بعد تینوں صاحبزادوں میں کافی کشمکش اور رسہ کشی رہی۔ شمس الدین احمد خاں نے دعویٰ دائر کیا کہ لوہارو کی مسند بھی مجھے ملنی چاہیئے اور دونوں بھائیوں کی پنشنیں ہونی چاہئیں۔ آخر کار دونوں جاگیروں کا فیصلہ نواب شمس الدین کے حق میں ہو گیا۔ ۱۸۳۲ء میں ولیم فریزر دہلی کے ایجنٹ مقرر ہو کر آئے۔ یہ نواب احمد بخش خاں کے خاص بے تکلف دوست تھے۔ انھوں نے یہ تجویز کی کہ نواب مرحوم کی تقسیم کے مطابق لوہارو دونوں چھوٹے صاحبزادوں کو ملنا چاہیئے (اس زمانے میں ایسٹ انڈین کمپنی کا ہیڈ کوارٹر کلکتہ تھا) ولیم فریزر کے مشورے اور تجویز کے مطابق امین الدین احمد خاں نے کلکتہ جا کر قانونی چارہ جوئی کی اور شمس الدین احمد خاں کے خلاف فیصلہ ہو گیا۔[۵] اس فیصلہ کے بعد ولیم فریزر کو ۱۸۳۵ء میں کسی شخص نے قتل کر دیا۔ تفتیش شروع ہوئی۔ قاتل کے ساتھی کے بیان سے نواب شمس الدین احمد خاں پر تحریض قتل کا الزام ثابت ہو گیا۔ اور بڑی زبردست احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کے بعد کشمیری دروازہ دہلی کے باہر نو سو فوجیوں کے پہرے میں اس بہادر رئیس کو پھانسی دیدی گئی۔ یہ واقعہ تمام

---

۵ غالب از مہر میں خاندان لوہارو کے مناقشات تفصیل کے ساتھ مذکور ہیں۔

مورخین کے متفقہ بیان کے مطابق ۱۲۵۲ھ میں ہوا۔ نواب شمس الدین احمد خاں قدم شریف میں مدفون ہیں۔ ان کا مدفن اس چبوترے کے پائیں ہیں جس پر نواب ابراہیم علی خاں والیٔ پاٹودی کا مزار ہے۔ یعنی قدم شریف میں داخل ہونے کا جو دروازہ ہے اس دروازے کے بالمقابل چبوترے کے نیچے سنگ مرمر کے تعویذ والی قبر انھیں کی ہے اور دوسری قبر برابر میں نواب شہاب الدین احمد ثاقب یعنی سائل صاحب کے والد کی ہے۔ نواب موصوف نے صرف دو لڑکیاں چھوڑیں محمد النساء بیگم یا (شمس النساء بیگم) دوسری احمد النساء بیگم۔ فیروز پور جھرکہ کی ریاست ضبط ہوگئی۔

جب نواب کو پھانسی دی گئی اس وقت داغ کی عمر ۶ سال سے کم تھی ان کی والدہ نے نواب شمس الدین احمد خاں کے پھانسی پا جانے کے بعد صاحب عالم مرزا محمد سلطان فتح الملک بہادر ولی عہد بہادر شاہ کے دامنِ عاطفت میں پناہ لی اور اپنی زندگی کا بہت بڑا حصہ محلِ شاہی میں گزارا اور نواب شوکت محل بیگم خطاب پایا[51]۔ ولی عہد مرزا فتح الملک عرف مرزا فخرو کی پہلی شادی مرزا الٰہی بخش بن مرزا بجو کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ مرزا الٰہی بخش المتوفی ۱۸۷۸ء کی والدہ عمدۃ الزمانی بیگم بنت عالمگیر ثانی تھیں۔ یہ مرزا الٰہی بخش وہی ذاتِ شریف ہیں جو نواب زینت محل کے ہاں کافی رسائی رکھتے تھے اور جنھوں نے شاہ دہلی کو نہایت آسانی کے ساتھ گرفتار کرا دیا تھا۔ شہر اور اندرون لال قلعہ کی ضروری خبریں سرکار انگریزی تک پہنچایا کرتے تھے۔ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ فرو ہونے کے بعد ان کے اس قابلِ قدر اور تاریخی کارنامے کے صلہ میں سرکار انگریزی کی طرف سے ان کے اور اُن کے خاندان کے لئے ۲۲۸۳۰ روپے سالانہ کی پنشن نسلاً بعد نسلٍ یکم مئی ۱۸۵۸ء سے عطا کی گئی۔ اس کے علاوہ بہت کافی انعامات و اکرامات سے نوازا گیا[52]۔ مولینا

---

[51] جلوۂ داغ صفحہ ۱ [52] تاریخ رؤسائے بااختیار و نامی خاندان پنجاب صفحہ ۱۸۹

ابوالکلام آزاد فرماتے ہیں۔ "ساونڈرس نے ان کی طرف ان لفظوں میں اشارہ کیا ہے کہ "فاتحوں کی خوشنودی کے لئے اگر ضرورت ہو تو وہ اپنے باپ کو بھی پکڑوا دے۔"
فاعتبروا یا اولی الابصار۔ ہنگامہ فرو ہونے کے بعد گورنمنٹ چاہتی تھی کہ قلعہ کے خاندان کا کوئی نام ونشان باقی نہ رہے۔ اس لئے الٰہی بخش جیسے خاندان فروش کو بھی دہلی میں دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ بہر حال کچھ دنوں کی زار نالی کے بعد انھیں قیام کی اجازت مل گئی اور خاندان شاہی کے ہیڈ قرار پائے۔ عید کے دن انھوں نے چاہا تھا کہ چار گھوڑوں کی گاڑی میں بیٹھ کر عید گاہ جائیں۔ ڈپٹی کمشنر کو معلوم ہوا تو چوبدار بھیج کر ممانعت کردی کہ یہ امتیاز قلعہ کے شہزادوں کو حاصل تھا اب وہ زمانہ گیا۔ فبعداً للقوم الظالمین[۵]"

نواب شمس الدین احمد خاں کی بڑی صاحبزادی محمد النساء بیگم نواب سعادت علی خاں کو منسوب ہوئیں جو نواب عبدالرحمٰن خاں والی جھجر کے چچا تھے۔ ان کی دو لڑکیاں سکندر جہاں اور اکبری بیگم اور ایک لڑکے نواب قاسم علی خاں مرحوم تھے۔ سکندر جہاں جناب سائل مرحوم کی والدہ ہیں اور اکبری بیگم نواب مختار حسین خاں والئ پاٹودی کی زوجہ ہیں۔ نواب قاسم علی خاں کی دو اولادیں ہیں نواب عباس علی خاں اور نواب سردار جہاں بیگم زوجۂ نواب ممتاز حسین خاں مرحوم والئ پاٹودی۔ نواب شمس الدین خاں کی دوسری صاحبزادی احمد النساء بیگم نواب غوث محمد خاں آف جاورہ کو منسوب ہوئیں۔

لوہارو

لوہارو کی چھوٹی سی نیم مختار ریاست پنجاب کے گوشہ جنوب مشرق میں واقع

۵؎ غالب از مہر صفحہ ۲۹

ہے۔ صاحب کمشنر دہلی اس کے پولٹیکل ایجنٹ ہیں۔ لارڈ لیک نے نواب احمد بخش خاں کو ۱۸۰۶ء میں جو سند عطا کی تھی اس کی رُو سے یہ ریاست بطور دوام نواب صاحب کے خاندان کو اس شرط پر عطا ہوئی کہ عندالطلب سرکار کو دو سو سوار دیں۔ ان کو اپنی رعایا پر دیوانی و فوجداری کے کامل اختیارات حاصل ہیں۔ مگر سزائے موت کے لئے صاحب کمشنر دہلی کا متفق ہونا ضروری ہے۔ اس ریاست کا رقبہ دو سَو اسی میل مربع ہے۔ آبادی ۲۰ ہزار کے قریب ہے۔ آمدنی ۶۵ ہزار روپے سالانہ ہے۔ یہ ریاست تھوڑی سی فوج بھی رکھتی ہے۔ اس کی ایک حد پر بیکانیر اور جے پور کی ریاستیں ہیں اور دوسری سرحد پر جیند اور حصار ہیں۔ لوہارو کا قریبی اسٹیشن بھوانی ہے جو اس سے ۴۴ میل کے فاصلہ پر ریواڑی فیروز پور لائن پر واقع ہے۔

اس ریاست کو دو عدد توپ کی اجازت ہے[۵۱]۔ نواب شمس الدین احمد خاں کے بعد ریاست لوہارو نواب امین الدین خاں کے سپرد کی گئی۔ ۱۲۸۶ھ میں اُن کا انتقال ہوا اور مہرولی میں درگاہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے قریب جو نواب علاؤ الدین کی ہڑوار ہے جس کو اب صندل خانہ کہتے ہیں[۵۲] اس میں دفن کیے گئے۔ اسی جگہ اب استاد مرحوم حضرت سائل کا مزار ہے۔

نواب امین الدین احمد خان کے بعد ان کے صاحبزادے نواب علاء الدین احمد خاں علائی جانشین ہوئے۔ ان کا انتقال ۱۸۸۴ء میں ہوا[۵۳] تو ان کے صاحبزادے نواب سر امیر الدین احمد خاں عرف فرخ مرزا جانشین ہوئے۔ ان کے بعد ان کے صاحبزادے نواب اعز الدین احمد خاں عرف اعظم مرزا جانشین ہوئے اور اعظم مرزا کے صاحبزادے

---

۵۱ ترجمہ پنجاب چیفس ۵۲ نواب خسرو مرزا فرماتے ہیں کہ اس ہڑوار کو نواب ضیاء الدین احمد خاں نے خرید کر وقف کیا تھا۔

۵۳ تاریخ رؤسائے پنجاب۔

نواب امین الدین احمد خاں ثانی موجودہ و آخری فرمانروائے لوہارو ہیں۔

۱۹۴۵ء کے چٹھے کی رُو سے ریاست لوہارو کی آمدنی ساڑھے چار لاکھ روپے ہوتی ہے[۵۱]۔ ریاست لوہارو کا صدر مقام قصبہ لوہارو ہے۔ یہاں قلعۂ معلےٰ پختہ و خام بیرونِ قصبہ واقع ہے۔ ایوان فرخ منزل جو معلّی القاب فخر الدولہ نواب سر امیر الدین احمد خاں بہادر، کے سی آئی ای نے ۱۸۸۵ء میں تعمیر کرایا تھا۔ جدید طرز کی خوبصورت عمارت ہے۔ دوسری خوبصورت عمارت محل فخر الدولہ سوم ہے جو ۱۸۵۳ء میں بعہد نواب امین الدین احمد خاں تعمیر ہوا تھا۔

مسجد جامع ۱۲۷۹ھ میں مرزا نذر محمد بیگ ناظم لوہارو نے جو کپتان صاحب کے لقب سے مشہور تھے تعمیر کرائی تھی۔ قدیم سکر بند مندر جس کا سال تعمیر معلوم نہیں کئی سو برس پہلے کی عمارت ہے۔ بیرونِ قصبہ جانبِ غرب مولوی عبدالرحمٰن کا مزار ہے۔ جو ایک بزرگ تھے۔ ان کے مزار کے قریب معزالدین اکبر مرزا کی قبر ہے[۵۲]۔

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان آزاد ہوا تو قومی حکومت نے ریاستوں کو توڑ کر بعض ریاستوں کو صوبوں میں شامل کر دیا اور بعض ریاستوں کی یونین بنا دی۔ یہ ریاست بھی اسی ضمن میں ختم ہو گئی۔

نواب امین الدین احمد خاں اور ان کے فرزند نواب علاؤ الدین احمد خاں۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں اور ان کے فرزند نواب شہاب الدین احمد خاں ثاقب سے مرزا غالب کے نہایت خوشگوار اور مخلصانہ تعلقات تھے۔ علاء الدین احمد خاں علائی تخلص کرتے تھے۔ ضیاء الدین احمد خاں اردو میں رخشاں اور فارسی میں نیّر تخلص کرتے تھے۔ یہ دونوں بھائی مرزا غالب کے شاگردِ خاص تھے۔ مرزا غالب کے خطوط کا بیشتر حصہ ان حضرات کے ناموں سے بھرا ہوا ہے۔ علائی کا ذکر ایک شعر میں بھی

---

[۵۱] مولانا اطہر ہاپوڑی بروایت نواب امین الدین احمد خاں ثانی عرف شہریار مرزا بن نواب اعزالدین احمد خان مرحوم والیٔ لوہارو۔ [۵۲] از جغرافیہ ریاست لوہارو ۱۹۱۷ء مرتبہ شمس الدین ناظم لوہارو۔

موجود ہے ؎

مجھ سے غالب یہ علائی نے غزل لکھوائی	ایک بیداد گر رنج فزا اور سہی

نواب ضیاء الدین احمد خاں

نواب صاحب مرزا غالب سے تلمذ رکھتے تھے اور ان کے خلیفۂ اوّل تھے نواب صاحب موصوف کی شادی اپنی چچازاد بہن سے ہوئی تھی جن کا نام تھا۔ حاجی بیگم بنت قدرت اللہ بیگ فیروز بن شرف الدولہ قاسم جان۔ حاجی بیگم کا انتقال ۱۳۱۳ھ میں ہوا۔ مہرولی میں اسی صندل خانہ میں مدفون ہیں جہاں حضرت سائل اور نواب ضیاء الدین احمد خاں اور نواب امین الدین احمد خاں مدفون ہیں۔ نواب صاحب موصوف روسائے شاہجہاں آباد میں نہایت ذی اقتدار اور بارسوخ اعلیٰ درجے کے سخن فہم سخن سنج اور تاریخی معلومات کا سرچشمہ مانے جاتے تھے۔ بڑے غیور اور پابند وضع رئیس تھے۔ قطع نظر کمالِ شاعری و انشاء پردازی کے تاریخ، جغرافیہ، علم انساب، علمِ اسماء رجال، تحقیق لغات اور جنرل انفارمیشن (معلوماتِ عامہ) میں اپنا نظیر نہ رکھتے تھے۔ اگرچہ انھوں نے فنونِ مذکورہ میں کوئی مستقل تصنیف نہیں چھوڑی لیکن اکثر مصنّفین ان سے مدد لیتے تھے اور جو مشکل پیش آتی تھی اس میں اُن سے مشورہ لیتے تھے۔ خصوصًا الیٹ صاحب نے جو ہندوستان کی تاریخ کئی جلدوں میں لکھی ہے اس کی تالیف و ترتیب میں نواب ممدوح نے بے انتہا مدد پہنچائی تھی جس کا مصنّف نے اپنی کتاب کے دیباچہ میں خود اعتراف کیا ہے[۱]

نواب صاحب کی عمر اس وقت سات برس کی تھی جبکہ ان کے والد نواب

۱؎ خمخانہ جاوید و یادگار غالب۔

احمد بخش خاں کا انتقال ہوا۔ والدۂ ماجدہ اور برادرِ معظم نواب امین الدین احمد خاں کی سرپرستی میں تعلیم و تربیت ہوئی۔

تفسیر و حدیث مولوی کریم اللہ رح شاگرد حضرت شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ سے پڑھی۔ ادب و فقہ مفتی صدرالدین آزردہ شاگرد حضرت شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ سے اور منطق و فلسفہ مولانا فضل حق خیرآبادی سے پڑھا۔ فارسی میں مرزا غالب سے استفادہ کیا۔

افسوس کہ نواب صاحب کا مجموعۂ کلام ہنگامہ ۵۷ء میں ضائع ہو گیا۔ امن ہونے کے بعد کچھ پرانے پرچوں اور مسخ شدہ مسودات سے اور کچھ حافظہ پر زور دے کر قلم بند کیا گیا۔ جس کو "صحیفہ زرّیں" کے نام سے ان کے چھوٹے صاحبزادے نواب احمد سعید خاں مرحوم اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر و آنریری مجسٹریٹ دہلی نے ۱۹۱۶ء میں شائع کیا۔

حضرت مفتی صدرالدین صاحب آزردہ اور مولانا فضل حق خیرآبادی اور مرزا غالب اگرچہ نواب ضیاء الدین احمد خاں کے اساتذہ میں تھے مگر ان سے دوستی اور ہم جلیسی کے مراسم بھی تھے۔ مولوی فضل حق صاحب ۵۷ء کے ہنگامہ کے فرو ہونے کے بعد بہ الزامِ بغاوت گرفتار کر کے جزائر انڈمان بھیج دیئے گئے تھے اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔ نواب صاحب موصوف نے ان کی تاریخِ وفات کہی۔ "فضل حق مرد" اور اسی سال رنگون میں بہادر شاہ کا انتقال ہوا۔ نواب صاحب نے مادۂ تاریخ کہا "خلد خوابگاہی"۔
۱۲۷۹ھ

"صحیفۂ زرّیں" یعنی مجموعۂ کلام نیرِ درخشاں پر جناب سائل نے بھی قطعہ تاریخ طباعت کہا ہے جو اس کے آخر میں شامل ہے۔
۱۲۷۵ھ

تقریباً ۱۸۵۵ء میں نواب صاحب موصوف نے دہلی کی آثارِ قدیمہ کی

سوسائٹی میں ایک لکچر دیا تھا جس میں انھوں نے تاریخی واقعات سے یہ ثابت کیا تھا کہ قطب مینار مسلمانوں کا ہی بنا یا ہوا ہے اور لکچر کے خاتمہ پر کہا کہ اس سے زیادہ قوی ثبوت اور کوئی پیش نہیں کیا جا سکتا کہ ان لوگوں کے مُردے خود اُٹھ کھڑے ہوں اور اپنے کام کی تصدیق کریں۔[۱]

مرزا غالبؔ

نواب ممدوح اہلِ کمال ہونے کی وجہ سے اہلِ کمال کے عاشق تھے اور خصوصیت سے غالب سے ان کا خاص تعلق تھا۔ ان کی چچازاد بہن اُمراؤ بیگم مرزا غالب سے منسوب تھیں۔ وہ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں فکرِ سخن کرتے تھے۔ مگر زیادہ تر فارسی نظم و نثر لکھتے تھے اور مرزا کے قدم بہ قدم چلتے تھے۔ مرزا نے جو ایک قصیدہ نہایت بلیغ و لطیف نواب ممدوح کی شان میں لکھا ہے اور جس میں ان کا استاد ہونے پر فخر کیا ہے اس کے کچھ اشعار مختلف مقامات سے التقاط کرکے یہاں لکھے جاتے ہیں:-

صد آفتاب تواں ساختن ببازیچہ ‎ ‎ ز ذرۂ کہ بود در ضیائے نیرِ من
نہ ایں سپہر نہ ایں مہر عالمے دگر است ‎ ‎ من آسمانم و او مہر نور گسترِ من
من آں سپہر کہ دائم چنانکہ مہر بماہ ‎ ‎ بہ مہر نور دہد نیرِ منورِ من
منم خزینہ راز و او درِ خزینہ راز ‎ ‎ ضیائے دین محمد کہیں برادرِ من
بدین و دانش و دولت یگانہ آفاق ‎ ‎ بعمر کہتر و از روئے رتبہ مہترِ من
بمہر دل بہ برادر دہم نہ یعقوبم ‎ ‎ کہ پور خویش بود دلستان و دلبرِ من
سخن سرائے نوآئیں نوائے را نازم ‎ ‎ بنالہ ہم نفس من بہ شور ہم سرِ من

---

[۱] واقعاتِ دارالحکومت جلد سوم ص ۱۸۵

به نکتهٔ شیوهٔ شاگرد من به من ماناست
صنم بصورتِ خود می تراشد آزرِ من

اگرچه اوست ارسطو و من فلاطونم
بود به پایه ارسطوئے من سکندرِ من

زمین کوئے مرا آسماں کند ہر صبح
طلوعِ نیّرِ رویش ز طرف منظرِ من

اگر شوم به مثل آتشے شرارہ فشاں
شود بقاعدۂ ہمدم سمندرِ من

به بحر گر فتدم رہ بود سفینۂ من
به تخت گر بودم رائے گرد و افسرِ من

به مہر دوست دہم دل نشاط خاطرِ من
به کین خصم نہم رخ لوائے لشکرِ من

گرم ز غصه تبه گشته کار مونس من
ورم ز کار فرو مانده دست یاورِ من

زہے ز روئے تو پیدا فروغ نازش و داد
بدیں فروغ جہاں تاب گشته اخترِ من

ز تو که آئینهٔ فیضِ صحبتِ اولی
ہوائے دیدنِ غالب فتادہ در سرِ من

مرا ستودی و گفتی که من از آں توام
فدائے آں تو بادا اقل و اکثرِ من

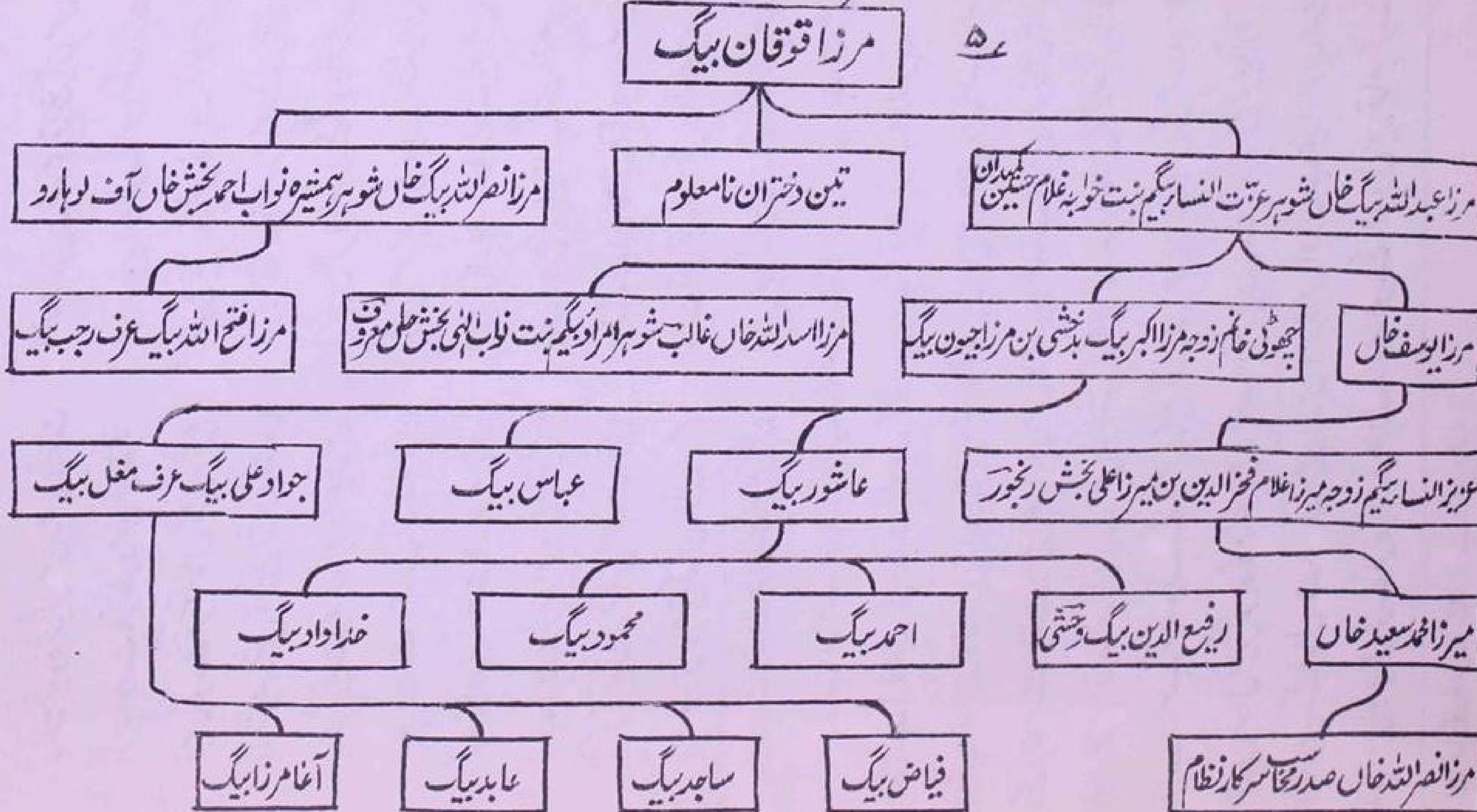
سعادت و شرفِ چوں منے بعرضِ کمال
نه بس بود که بود به چوں توئے شاگرِ من [۵۱]

نواب صاحب اور مرزا غالب کے تعلقات کا اندازہ اس بات سے بھی ہو سکتا ہے کہ غالب کی وفات کے بعد آٹھ سو روپے کا قرضہ نواب موصوف نے ادا کیا۔ غالب کا فارسی دیوان پہلی مرتبہ نولکشور پریس میں نواب صاحب موصوف کے اہتمام سے ۱۸۶۱ء میں چھپا اور اس کا مسودہ شہاب الدین احمد خاں ثاقب (والد محترم حضرتِ سائل) نے منشی نولکشور کو بھیجا تھا۔ مرزا غالب کا تمام مجموعۂ تصنیف نواب صاحب موصوف کے پاس جمع تھا اور انھوں نے اس کی عمدہ مطلا جلدیں بنوائی تھیں[۵۲]۔ ہنگامۂ غدر میں جب انگریزوں نے شہر کو فتح کر لیا تو عزت و ناموس کے خیال سے نواب امین الدین احمد خاں اور نواب ضیاء الدین احمد خاں اپنے اہل و عیال کو لے کر لوہارو کی طرف روانہ ہوئے۔ مہرولی میں قیام کرتے

---

۵۱ "یادگارِ غالب" ۵۲ غالب از مہر وغیرہ۔

شجرۂ نسب مرزا غالب



ہوئے دوجانہ پہنچے۔ وہاں کے رئیس حسن علی خاں بہادر نے ان کی بڑی مدارات کی۔ کمشنر دہلی نے دونوں کو واپس بلایا اور جواب طلب کیا۔ صلح آمیز جواب پاکر کچھ تعرض نہ کیا اور قلعہ میں قیام کی اجازت دی۔ دہلی میں ان کا مکان بالکل لُٹ گیا تھا اور مہرولی کے قیام کے دوران میں بھی ان کا سامان خوب لُٹا[۱] اور اسی میں مرزا غالب کا مجموعہ تصانیف بھی ضائع ہو گیا۔ ہنگامہ فرو ہونے کے بعد بڑی محنت اور جستجو سے جو کچھ مل سکا دوبارہ جمع کیا گیا

اُستاد مرحوم (حضرت سائل) نے ایک واقعہ مجھ سے بیان کیا تھا۔ عرصہ گزر جانے کی وجہ سے حافظہ پر زور دے کر لکھتا ہوں۔ ایک مرتبہ استاد ذوق کابلی دروازہ کے قریب جہاں ان کا دولت خانہ تھا کسی جگہ پیشاب کرنے کے لئے بیٹھے اس اثنا میں ایک مصرع ذہن میں آگیا۔ پیشاب سے فارغ ہو کر استنجا سُکھلاتے ہوئے اور مصرع ثانی کی فکر کرتے ہوئے چل پڑے۔

اس قدر استغراق ہوا کہ صدر بازار، سبزی منڈی ہوتے ہوئے اسی حال میں محلدار خاں کے ترپولیہ تک پہنچ گئے۔ اتفاق سے نواب ضیاء الدین احمد خاں اپنے باغ کی طرف سے اپنی بگھی میں شہر کی طرف آرہے تھے۔ انھوں نے استاد ذوق کو سرِ شام اس جگہ دیکھ کر تعجب کیا، بگھی روک کر اُترے اور پکار کر کہا۔ اُستاد آپ یہاں کہاں؟ اب استاد ذوق جاگے اور چاروں طرف دیکھنے لگے۔ ڈھیلا پھینک کر کہنے لگے لاحول ولاقوۃ! کہاں آگیا؟ پھر فرمایا کہ بھئی میں پیشاب کرنے بیٹھا تھا۔ ایک مصرع ذہن میں آگیا تھا اس پر مصرع ثانی کی فکر کر رہا تھا۔ بڑی خیر ہوئی کہ تم نے دیکھ لیا ورنہ میں جانے کہاں پہنچ جاتا۔ نواب صاحب نے ان کو اپنی بگھی میں بٹھا کر گھر پہنچایا اور حضرت ظفر بہادر شاہ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میں نے حضور کے

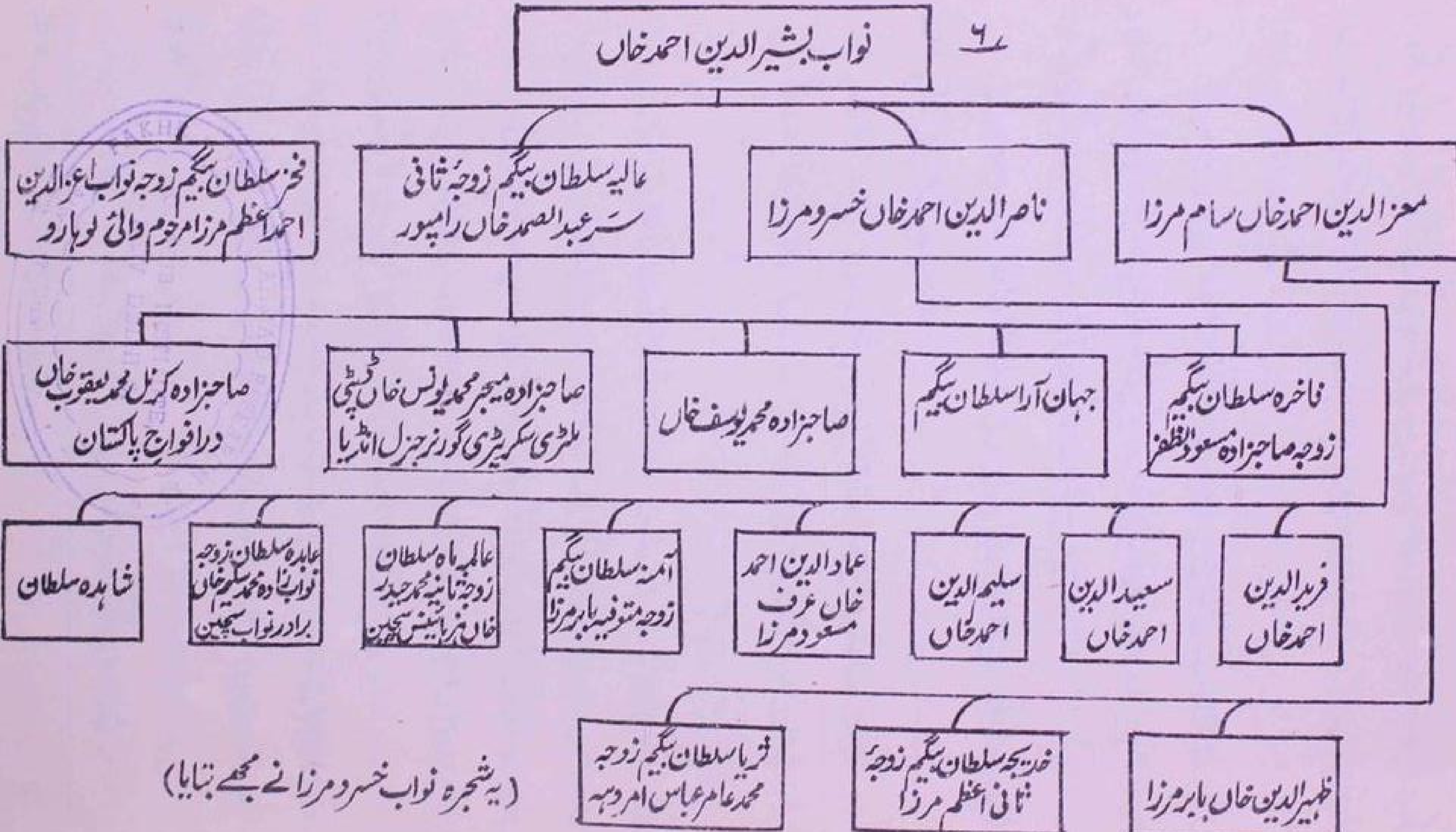
۱؎ دستنبوئے غالب مطبوعہ لٹریری سوسائٹی پریس بریلی ۱۸۶۵ء

استاد کی جان بچائی ہے مجھے اسی کا انعام مطلوب ہے۔ پھر پورا واقعہ حضور سلطانی میں عرض کیا گیا کافی دیر تک دلچسپی رہی۔ بادشاہ نے کئی بہنگیاں آموں کی اور کچھ خلعت وغیرہ نواب صاحب کو عطا فرمایا اور اُستاد کی جان بچنے کے شکریئے میں خیرات وغیرہ بھی کی۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں کا وہ باغ اب بھی موجود ہے۔ اس کا نام "نور باغ" ہے۔ یہ محلدار خاں سے تین میل کے فاصلہ پر آزاد پور کے متصل ہے۔ اس کے دروازے کے بائیں بازو پر کتبہ لگا ہوا ہے:

نور باغ ۱۲۹۵ھ

اب دلّی کی آٹھویں بربادی میں نور باغ پر غیروں کا قبضۂ غاصبانہ ہو گیا تھا جو قانونی چارہ جوئی کے بعد ۱۳ر دسمبر ۴۸ء کو بحق مالکان بحال ہو گیا۔ اس میں مالکانہ حیثیت سے نواب خسرو مرزا اور احتشام الدین علی احمد اور شمس الدین علی احمد اپنے اپنے حصّہ کے مطابق شریک تھے۔ اس کے بعد حکومت نے اس کو سبزی منڈی بنانے کے لئے ایکوائر کر لیا اور مالکان کو جزوی سا معاوضہ دے دیا گیا۔ نواب صاحب موصوف کے انتقال کے بعد اُن کی محل سرا جو گلی قاسم جان میں ہے اور نور باغ جو معظم زمانی بیگم عرف بگا بیگم کے حصّہ میں آیا تھا ان کے بعد ان کی تین صاحبزادیوں جندو بیگم، بندو بیگم، مچھن بیگم اور ان کی اولاد میں منتقل ہوا۔ اب اس میں جندو بیگم زوجہ تاباں مرحوم اور بندو بیگم زوجہ مرزا بشیر الدین احمد خاں کے صاحبزادے سام مرزا اور خسرو مرزا وغیرہ اور مچھن بیگم زوجہ کرنل زیڈ احمد کی اولاد اپنے حصّہ کے مطابق شریک ہیں۔ نواب صاحب کی کوٹھی اور کتب خانہ اور نقد روپیہ اور کچھ مہرولی کی جائداد و زمین وغیرہ نواب احمد سعید خاں کے حصّہ میں آئی تھی۔

نواب شمس الدین احمد خاں کے بعد جب ریاست لوہارو نواب امین الدین احمد خاں کے قبضہ میں آئی تو ان دونوں بھائیوں میں اختلاف شروع ہوا۔ دس بارہ سال کے بعد اکتوبر ۱۸۴۷ء میں نواب ضیاء الدین احمد خاں نے دعویٰ دائر کیا۔ فیصلہ



(یہ شجرہ نواب خسرو مرزا نے مجھے بتایا)

یہ ہوا کہ ریاست تقسیم نہیں کی جائے گی بلکہ حسبِ دستور روپیہ ملتا رہے گا۔ پھر روپیہ کی مقدار کے متعلق اختلاف ہوا۔ اس کے نتیجہ میں بارہ ہزار روپیہ سالانہ کے بجائے اٹھارہ ہزار روپیہ سالانہ کر دیا گیا۔[1]

نواب ضیاءالدین احمد خاں کے انتقال کے چار پانچ سال کے بعد ۱۸۸۵ء میں یہ الاؤنس گھٹا کر بارہ ہزار روپیہ سالانہ کر دیا گیا جو بحصہ رسدی نواب سعید الدین احمد خاں اور ان کے چار بھتیجوں اور نواب مرحوم کی چار بیگمات میں تقسیم ہوتا رہا۔[2]

نواب صاحب کا انتقال ۱۳۰۲ھ میں ہوا۔ مولوی رضی الدین احمد صاحب دہلوی نے قطعۂ تاریخ کہا جو قبر پر کندہ تھا۔

چوں ضیاءالدین احمد خاں کشید — رخت از دنیا سوئے دارالسلام
گفت ہاتف بارضی سالِ وفات — روزِ شنبہ سیزدہ شہرِ صیام

۱۳۰۲ھ

اور مہرولی میں اپنے بھائی نواب امین الدین احمد خاں کے پہلو میں دفن ہوئے۔ دلّی کی آٹھویں بربادی میں آثارِ قدیمہ کو بہت بُری طرح برباد کیا گیا۔ نواب امین الدین احمد خاں کا مزار تو خیر بچ گیا مگر نواب ضیاءالدین احمد خاں کا مزار توڑ پھوڑ دیا گیا۔ کرنل زیڈ احمد (ذوالنور علی احمد) شوہر مجھن بیگم کا مزار اور خوبصورت سنگِ مرمر کا مجّر وغیرہ بالکل نذارد ہو گیا۔ یعنی زمین پر مٹی کا ڈھیر بھی نہیں چھوڑا۔ (رہے نام اللہ کا)

نواب صاحب موصوف رشتے میں داغ کے چچا ہیں۔ جب داغ کا دیوان ... "گلزارِ داغ" چھپا تو انھوں نے نواب صاحب کی خدمت میں بھیجا۔ نواب صاحب نے تقریظ لکھی ؎

نازم آن نخلبند معنی را — کہ بیاراست از سخن صد باغ

---

[1] غالب از مہر صفحہ ۴۲ [2] تاریخ روسائے پنجاب۔

گل رنگین باغ دل افروز — در و خوشبوئے عطر بیز دماغ
روح نازک خیالیٔ او را — باید آنسوئے عرش جست سراغ
معنی نغز از دلش ریزاں — چوں مئے ناب از کنارِ ایاغ
کردہ مشکیں غزال مضموں صید — صفحۂ خاطرش ختن را راغ
جمع کردہ کلام روشن خویش — کہ شبستانِ فکر راست چراغ
ہر گہ از طبع تازہ اش دل خواہ — للہ الحمد دست داد فراغ
سال ختمش بخواں کہ ایں دیواں — زد بدلہا جدید سکۂ داغ
ساخت ایں قطعہ نیّرؔ از دہلی — نزد نواب میرزا ابلاغ ۱؎

نواب صاحب موصوف کے متعلق سر سید احمد خاں نے آثار الصنادید میں جو کچھ لکھا ہے اور مرزا عبد الغنی ارشد گورگانی (استاد جناب سائل) نے ایک مدحیہ قصیدہ میں جو کچھ اظہارِ عقیدت کیا ہے اس سے ان کی عظمت کا صحیح اندازہ ہو جاتا ہے یہ خاصا طویل قصیدہ ہے۔ اس میں سے چند اشعار درج ذیل کرتا ہوں :-

ساقیا عید است و خرم شد زمانِ آفتاب — آفتابے بایدم اندر میانِ آفتاب
ہاں بہ بزم میکشاں ساغر خرامی کار تست — بر فلک ہیں دورۂ رطلِ گرانِ آفتاب
موج موج آب گلگوں بر بساطِ من فگن — تا زہمش لرزہ افتد بر روانِ آفتاب
آفتاب ار میہمان صبح عید میکشاں است — صبح عید میکشاں بہ میہمانِ آفتاب
دشتہا بر فرق بردارم ز جوش نشۂ — افگنم خاک خجالت در دہانِ آفتاب
چوں ازیں صہبا خمارم فرق بر بالا کشد — مدحت ممدوح گویم از زبانِ آفتاب
مطلع روشن بخوانم در حضور منعمے — آنکہ نورش بر فزاید عز و شانِ آفتاب
آنکہ رایت مظہر رازِ نہانِ آفتاب — وہ کہ رویت آفتاب اندر جہانِ آفتاب

۱؎ صحیفۂ زرّیں صفحہ ۱۵۲

اے ضیاء الدین احمد خاں بہادر نام تو   آفتاب آسمان و آسمانِ آفتاب
تو ضیائی و زضیا مہر ست بالا در جہاں   ذات پاکت کے توان گفتن لسانِ آفتاب
ارزش از گوہر نکو باشد نہ از ارزش گہر
رفعت شانش فزوں تر از گمان آفتاب   (صحیفۂ زریں)

نیرؔ ان کے انتقال پر مولانا شبلی نعمانی مرحوم نے جو انتہائی درد انگیز مرثیہ کہا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں نواب صاحب کی ذات گرامی علم و فضل کے کس قدر بلند مقام پر تھی اور دنیائے ادب کو ان کے نہ ہونے سے کتنا عظیم نقصان برداشت کرنا پڑا۔

مرثیہ نواب ضیاء الدین خاں مرحوم دہلوی متخلص بہ نیرؔ (۳ اکتوبر ۱۸۸۵ء)

گرم ہنگامہ شو اے نالۂ دل ہاں برخیز   از پئے بر ہمئ عالم امکاں برخیز
تو ہم اے آہ جہاں سوز بہ ساماں برخیز   اے جنوں باز بتاراج گریباں برخیز
چشم خوں نابہ فشاں خواست چو طوفاں کردن
خون شو اے دل کہ تو انم سر و ساماں کردن

دو جہاں ایں ہمہ در ہم شدہ چوں است و چہ ہست   آسماں حلقۂ ماتم شدہ چوں است و چہ ہست
مہر داغ دلِ عالم شدہ چوں است و چہ ہست   اختراں دیدۂ پُر نم شدہ چوں است و چہ ہست
شاہد روز بمرگ کہ ؟ بماتم بنشست
از چہ ؟ لیلائے شب آشفتہ و در ہم بنشست

تا چہ ہست ایں کہ دل از نالہ نیا سود ہنوز   ہمچناں زخم جگر ہست نمک سود ہنوز
اشک از دیدہ بر آید جگر آلود ہنوز   آتشے ہست ہمانا کہ رود دود ہنوز
فاش گویم کہ سخن گوئے زماں روئے نہفت
تیرہ شد دہر کہ نیرؔ ز جہاں روئے نہفت

آں طرازِ سخن آن یوسف کنعان سخن　　آنکہ آراست زنو زلف پریشان سخن
آنکہ صد پایہ فزود از سخنش شان سخن　　آنکہ لعل و گہر افشاند بدامان سخن
دو سہ روز است کہ از جامِ اجل مدہوش است
عالمے زد بسخن ماندہ و او خاموش است
آں گراں پایہ کہ دوں مرتبۂ اوست سخن　　شاعرے کز دمِ کلکش ہمہ جادو است سخن
فیض او بیں کہ بایں ننگ دہاں بوست سخن　　خواجہ او بود و تواں گفت کہ ہندوست سخن
اینک از دستِ اجل جیب جوش چاک است
پایۂ فن بفلک بردہ و خود در خاک است
علم و فن را بجہاں داد گرے بود نماند　　نکتہ سنج سخن و دیدہ ورے بود نماند
درجہاں نخل ہنر را ثمرے بود نماند　　نظم را خامۂ او بال و پرے بود نماند
اے سخن گریہ بروز سیہ ات باید کرد
اے ہنر رحم بحال تبہ ات باید کرد
شبلیا! دست نہ در دامنِ ادراک بزن　　شیشہ صبر دریں حادثہ بر خاک بزن
اے جنوں جیب و گریبان خرد چاک بزن　　تو ہم اے نالہ سراپردۂ افلاک بزن
گر نہ خوں گشتہ بمژگان ترم می آئی
آخر اے دل بچہ کار دگرم مے آئی　(کلیات شبلی فارسی)

نواب صاحب موصوف کے دو فرزند تھے۔ اول نواب مرزا شہاب الدین احمد خاں ثاقب۔ دوم میرزا سعید الدین احمد خاں طالب (عرف نواب احمد سعید خاں) اور ایک صاحبزادی تھیں معظم زمانی بیگم عرف بگا بیگم جو مرزا باقر علی خاں کامل ابن عارف کو منسوب تھیں۔

نواب میرزا سعید الدین احمد خاں طالب

معروف بہ نواب احمد سعید خاں دہلوی ۱۸۵۲ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۷۹ء میں سر رابرٹ ایجرٹن لفٹنٹ گورنر پنجاب نے آپ کو سرکاری ملازمت میں منتخب کیا۔ آٹھ سال تک اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر رہے۔ ترکِ ملازمت کے بعد میونسپل کمشنر بھی ہو گئے تھے۔ ابتداء میں چند غزلیں مرزا غالب کو دکھائیں۔ ان کے انتقال کے بعد اپنے بھائی حضرت ثاقب سے اصلاح لینے لگے پھر اپنے والد کے ایما سے میر مہدی مجروح کو کلام دکھایا[1]۔ نہایت پابند وضع خوش رو خوش خو اور ذی علم بلند خیال شاعر تھے۔ خمخانۂ جاوید پر جو آپ نے تقریظ لکھی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لغات اور زبان کے بارے میں آپ کی معلومات بھی بہت وسیع درجہ رکھتی ہیں۔ ریاست لوہارو سے پانسو روپے ماہوار وظیفہ تھا[2]۔ یکم ستمبر ۱۹۲۵ء مطابق ۱۳۳۷ھ میں انتقال ہوا اور اپنے والد محترم نواب ضیاء الدین احمد خاں کے قریب مہرولی میں مدفون ہوئے[3]۔

دہلی گلی قاسم جان احاطہ کالے صاحب کے قریب جو نواب احمد سعید خاں کی مسجد کہلاتی ہے یہ دراصل ان کے پردادا عارف جان کے بڑے بھائی نواب قاسم جان نے ۱۱۹۳ھ میں بنوائی تھی[4]۔

نواب شہاب الدین احمد خاں ثاقب

نواب ضیاء الدین احمد خاں مرحوم کے بڑے صاحبزادے ۱۸۴۰ء میں پیدا ہوئے تھے۔ چھوٹی سی عمر میں اپنے ذاتی علم و فضل اور خوش اخلاقی کی وجہ سے کافی شہرت حاصل

---

[1] خمخانہ جاوید جلد پنجم [2] واقعات دار الحکومت دہلی حصہ دوم ص ۲۰۱ [3] نواب خسرو مرزا فرماتے ہیں کہ طالب مرحوم کی صحیح تاریخ وفات ۳۱ اگست ۱۹۱۹ء ہے۔ [4] واقعات دار الحکومت دہلی ص ۳۴۳/۲۶

کرلی تھی اور آنریری مجسٹریٹ کے عہدے پر بھی فائز تھے۔ مرزا غالب انھیں بہت عزیز رکھتے تھے۔ علمی استعداد بہت معقول تھی۔ عین عالمِ شباب میں بعمر ۲۹ سال ۲۶ محرم الحرام ۱۲۸۶ھ یوم دوشنبہ مطابق ۹ اپریل ۱۸۶۹ء میں اپنے والد محترم کے سامنے ہی انتقال کیا اور وصیت کے مطابق درگاہ قدم شریف میں نواب شمس الدین احمد خاں کے پہلو میں دفن ہوئے[1]۔ اس وقت استاد مرحوم حضرت سائل کی عمر پانچ سال کی تھی۔ اس لئے دادا کی نگرانی میں تعلیم و تربیت ہوئی۔ نواب مرزا شہاب الدین احمد خاں بہادر کی شادی سکندر جہاں بیگم کے ساتھ ہوئی تھی۔ مرزا غالب نے اس موقع پر سہرا کہا جس کے دو شعر غیر مطبوعہ کلام میں پائے جاتے ہیں :۔

بزم شادی ہے فلک کاہکشاں ہے سہرا
ہم نشیں تارے ہیں اور چاند شہاب الدین خاں

ہے تو کشتی میں ولے بحرِ رواں ہے سہرا
ان کو لڑیاں نہ کہو بحر کی موجیں سمجھو

سکندر جہاں بیگم یعنی سائل صاحب کی والدہ نواب شمس الدین احمد خاں کی نواسی اور نواب سعادت علی خاں کی صاحبزادی اور نواب قاسم علی خاں رئیس جاورہ کی بہن تھیں۔ بعد میں یہ ریاست پاٹودی کے دیوان تھے۔ ان کی دو بہنیں تھیں۔ ایک سکندر جہاں اور دوسری اکبری بیگم۔ سکندر جہاں نواب شہاب الدین احمد خاں ثاقب کو اور اکبری بیگم نواب مختار حسین خاں والی پٹودی (المتوفی ۱۸۷۸ء) کو منسوب تھیں۔

اکبری بیگم کی بیٹی گوہر سلطان زمانی بیگم عرف ممو بیگم (یعنی سائل صاحب کی خالہ زاد بہن) تھیں جو سائل صاحب کو منسوب ہوئیں اور اکبری بیگم کے صاحبزادے یعنی نواب ممتاز حسین خاں بن نواب مختار حسین خاں کو نواب قاسم علی خاں ... کی صاحبزادی سردار جہاں بیگم منسوب ہوئیں یہ سائل صاحب کی ماموں زاد بہن ہیں۔

---

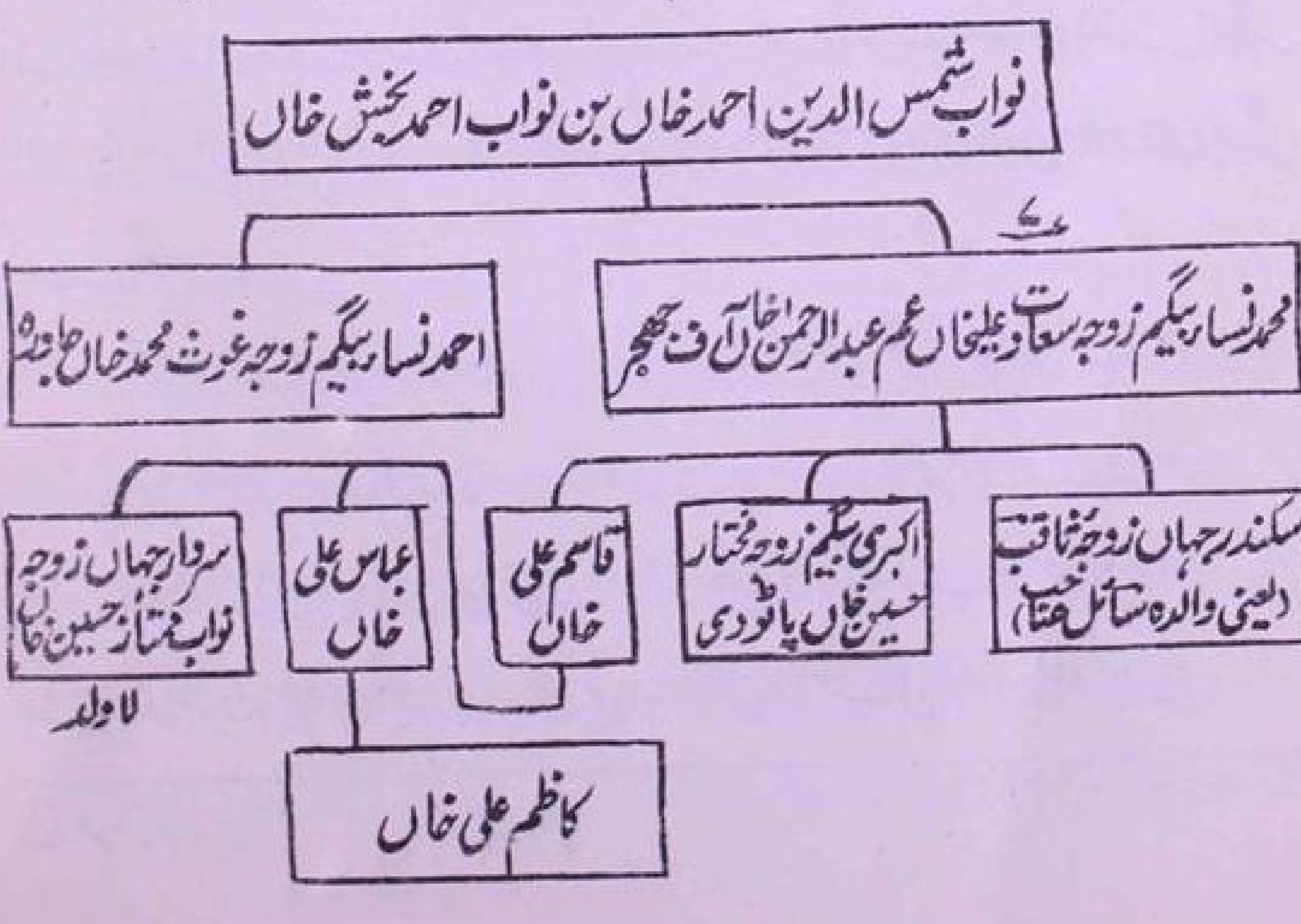
[1] خمخانہ جاوید۔

نواب عباس علی خاں اور سردار جہاں بیگم یہ دو اولادیں نواب قاسم علی خاں کی مجھے معلوم ہیں۔ نواب عباس علی خاں جن کی جائداد عباس منزل کے نام سے اُردو بازار میں تھی۔ ان کے فرزند کاظم علی خاں آجکل امریکہ میں ہیں۔ (یہ جائداد مالکان کتب خانہ رشیدیہ نے خرید لی ہے)

اس خاندان سے مرزا غالب کے جو روابط اور محبت و مودّت کے تعلقات تھے وہ مرزا کے کلام اور خطوط سے واضح طور پر معلوم ہوجاتے ہیں اور مرزا سے رشتہ کے لحاظ سے بھی کئی وابستگیاں تھیں۔

سائل مرحوم کے جدّ امجد نواب ضیاء الدین احمد خاں کی چچا زاد بہن امراؤ بیگم غالب کی رفیقۂ زندگی تھیں۔ سائل مرحوم کے پردادا نواب احمد بخش خاں کی بہن مرزا غالب کے چچا میرزا نصر اللہ بیگ کو منسوب تھیں۔ سائل مرحوم کی پھوپھی معظم زمانی (عرف بگا بیگم) باقر علی خاں کامل بن عارف کو منسوب تھیں۔

امراؤ بیگم کی بہن بنیادی بیگم کے صاحبزادے عارف (غالب کے متبنّیٰ) کو سائل مرحوم کے والد کی پھوپھی نواب بیگم منسوب تھیں۔ مرزا زین العابدین خاں عارف



اپنے والد اور اپنی والدہ دونوں سلسلوں کے لحاظ سے سائل صاحب کے چچا ہوتے ہیں۔ اس طرح مرزا غالب سائل صاحب کے دادا ہوئے۔ ع

"غالب میرے دادا تھے غالب کا میں پوتا ہوں" (سائل مرحوم)

فرماتے تھے کہ جب میری عمر پانچ سال کی تھی اپنے دادا کے ساتھ مرزا غالب کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ مرزا صاحب نے مجھے کھانے کی کوئی چیز دی اور خود کسی کام کے لئے اُٹھ گئے۔ اس وقت مرزا کے سامنے کوئی قلمی کتاب تھی جس کا وہ مطالعہ کر رہے تھے۔ اُٹھتے وقت کتاب کھلی چھوڑ دی۔ میں نے کھانے کی چیز کو اسی کتاب پر رکھ کر شوق کیا۔ اتنے میں دادا آگئے اور ناراض ہونے لگے۔ مرزا غالب نے یہ دیکھ کر قہقہہ لگایا اور نواب صاحب سے کہا کہ میاں میرا بچہ تو امتحان کی تیاری کر رہا ہے اور تم اس کو ڈانٹ رہے ہو۔ ورق خراب ہو چکا تھا کچھ جھاڑ پونچھ کر کتاب کو رکھ دیا گیا۔ پھر مرزا نے مجھ سے کہا کہ تم اپنے دادا سے فارسی پڑھتے ہو لو ایک شعر کا مطلب تو بتاؤ۔ وہ شعر مجھے یاد نہیں رہا۔ بہر حال کوئی آسان اور سہل شعر تھا۔ میں اس کا مطلب واضح نہ کر سکا تو پھر خود مجھے سمجھانے کی کوشش فرمائی۔

سائل صاحب کا خاندان بلحاظ تہذیب و متانت، وسعتِ اخلاق اور علم و ادب کے ہندوستان کے ممتاز ترین خاندانوں میں سے تھا۔

سائل کو تم نہ چشمِ حقارت سے دیکھنا
نواب پانچ پشت سے اس کا خطاب ہے

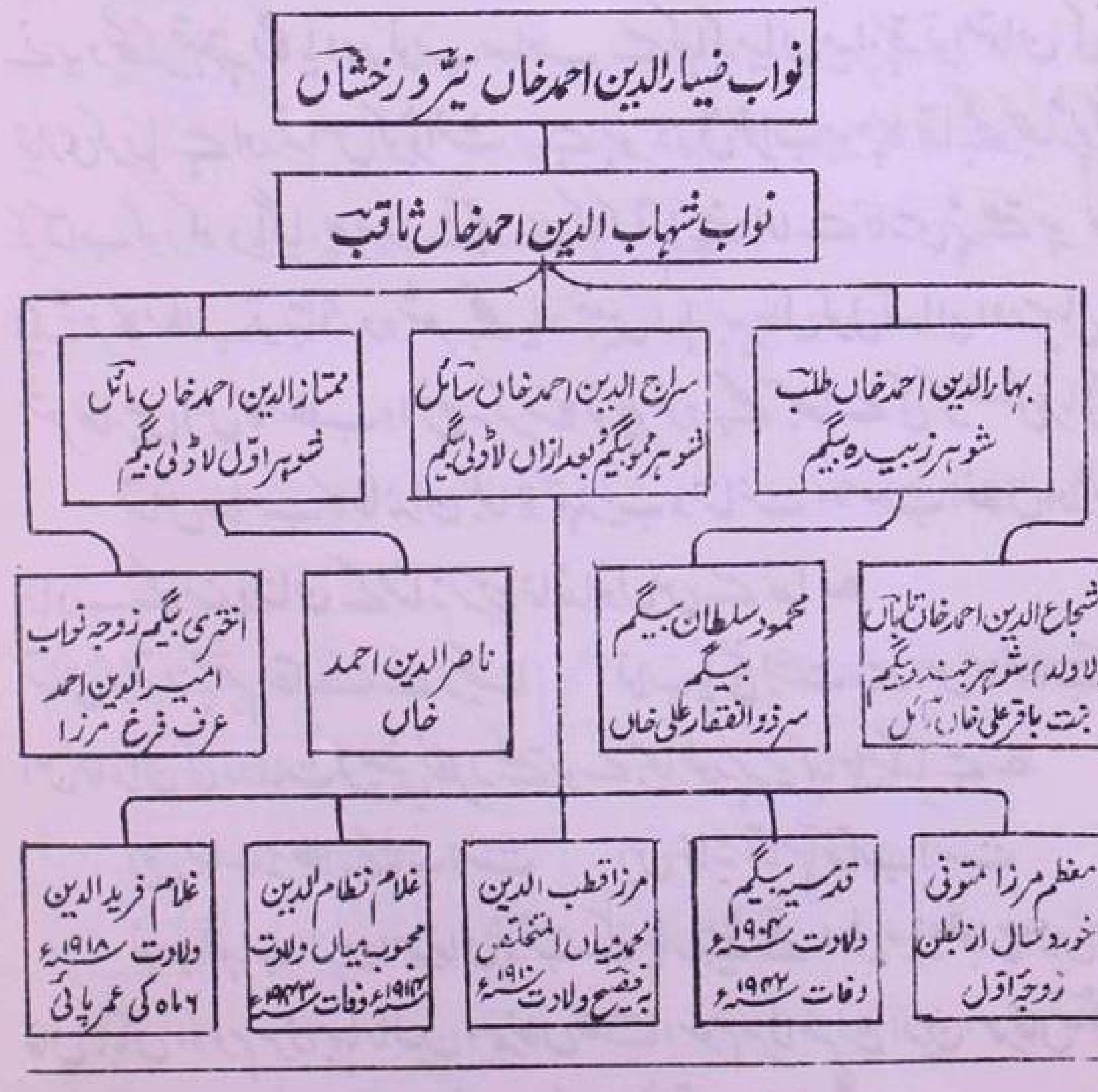
اس خاندان کی روایات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے۔

ایں سلسلۂ طلائے ناب است
ایں خانہ تمام آفتاب است

نواب شہاب الدین احمد خاں ثاقب کے چار بیٹے تھے۔ اول مرزا شجاع الدین احمد خاں تاباں، دوم مرزا بہاء الدین احمد خاں طالب، سوم مرزا سراج الدین احمد خاں سائل، چہارم مرزا ممتاز الدین احمد خاں مائل اور ایک بیٹی تھیں اختری بیگم۔

مرزا شجاع الدین احمد خاں تاباںؔ

بروز سہ شنبہ ۲۰ رجمادی الثانی ۱۲۷۸ھ مطابق ۲۳ر دسمبر ۱۸۶۱ء میں پیدا ہوئے۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں نے مادۂ تاریخ "نور چشمم نور چشمم" کہا[1]۔ علومِ مشرقی میں معقول دستگاہ رکھتے تھے۔ شعر و سخن میں نواب حسین علی خاں شاداںؔ مرحوم اور اپنے دادا سے مستفید ہوئے۔ بہت زود گو تھے۔ کلام میں مرزا غالب کا رنگ غالب تھا۔ داغ کے رنگ کو بہت ناپسند کرتے تھے۔ نہایت مغلوب الغضب تھے اور گالیاں عجیب و غریب قسم کی ایجاد کرتے تھے۔ جملہ اصنافِ سخن میں دخل رکھتے تھے۔ اپنا کلام سنانے کے لئے کسی نہ کسی



---

[1] صحیفۂ زرّین

کو پکڑ لیتے تھے اور گھنٹوں سُناتے رہتے تھے اور داد چاہتے تھے۔ اگر کوئی شخص داد نہ دے یا اُن کو اُستاد کے لفظ سے خطاب نہ کرے تو وہ اس کو نااہل سمجھتے تھے۔

حضرت نوح ناروی فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ جبکہ میں حضرت سائل کے دولت خانے پر بطور مہمان مقیم تھا تاباں صاحب بھی سائل صاحب کے مکان پر موجود تھے تھوڑی دیر کے بعد اپنے گھر جانے لگے اور مجھ کو پکڑ لیا کہ میرے گھر چلو۔ میں نے عرض کیا کہ ابھی کھانا نہیں کھایا ہے اور آپ کے ہاں جا کر معلوم نہیں کس وقت واپسی ہو۔ فرمایا میرے ساتھ کھا لینا۔ جب میں ان کے ساتھ چلنے کے لئے تیار ہو گیا تو سائل صاحب نے چپکے سے فرمایا "خدا حافظ، خدا تمھیں بخیریت واپس لائے"۔ میں نے تعجب کے ساتھ سائل صاحب کے چہرے کو دیکھا۔ سائل صاحب نے زیرِ لب مسکرا کر فرمایا کہ زندگی ہے تو بچ کر آ جاؤ گے۔ چنانچہ میں طوعاً و کرہاً تاباں صاحب کے ہاں گیا۔ دوپہر کا وقت تھا بھوک لگ رہی تھی۔ گھر جا کر تاباں صاحب نے نوکروں کو کچھ ہدایات دیں اور مجھ کو غزل سنانے لگے۔ جب دس بارہ غزلیں سُنا چکے تو نوکر کھانا لے کر آیا۔ غربا یار کھ دیے۔ وہ غزلیں سُنائے چلے جاتے تھے اور میرا بھوک کے مارے برا حال تھا۔ میں نے عرض کیا اب کھانا کھا لیجئے مگر وہاں تو استغراق کی کیفیت تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر میں نے تقاضا کیا۔ فرمایا تم کھا لو۔ چنانچہ مجبور ہو کر میں نے تنہا کھانا کھایا۔ اور وہ غزلوں پر غزلیں سناتے رہے۔ اس طرح انھوں نے غالباً تیس پینتیس غزلیں سنائیں۔ خدا کی پناہ۔ شطرنج بھی بہت عمدہ کھیلتے تھے اور اس میں بھی انہاک کا یہی حال تھا۔

نہایت وجیہ اور خوبصورت، وسیع الاخلاق اور مشرقی تہذیب اور بالخصوص دہلی کی روایتی اور خاندانی شرافت کے نمونہ تھے۔ سائل صاحب ان کا بیحد احترام کرتے تھے۔

۰ ۱۷؍اپریل ۱۹۱۷ء کو ہاپوڑ کے مقام پر ابن علی صاحب رفیق نے جو مشاعرہ منعقد کیا تھا اس میں نواب احمد سعید خاں طالب اور نواب شجاع الدین احمد خاں تاباں بھی تشریف لے گئے تھے مگر اسٹیشن پر ان کے لئے سواری کا کوئی خاطر خواہ انتظام منتظمینِ مشاعرہ نے نہیں کیا جس سے ان کو تکلیف پہنچی۔ بہرحال اسٹیشن سے ایک بگھی میں سوار ہو کر مقامِ مشاعرہ کی طرف چلے۔ راستہ میں گھوڑا بھڑک گیا اسٹیشن واپس آگئے اور دہلی روانہ ہوگئے۔ اسٹیشن پر حضرت نوح ناروی موجود تھے۔ تاباں صاحب نے دیکھ کر لپٹا لیا اور فرمایا ایک مطلع ہوا ہے، سُنایا۔ نوح صاحب نے داد دی فرمایا کہ اگر مشاعرہ میں پڑھتا تو چھتیں اڑ جاتیں۔ نوح صاحب نے فرمایا حضرت آپ کیا فرماتے ہیں بلکہ آسمان پھٹ جاتا۔ اس کے بعد عرض کیا کہ چچا جان تو ناراض ہو کر واپس جا رہے ہیں۔ آپ کیوں تشریف لے جا رہے ہیں۔ فرمایا چچا جان کو چھوڑ کر میں مشاعرہ میں کس طرح شریک ہو جاؤں؟[1] چنانچہ دونوں چچا بھتیجے دہلی واپس آگئے۔

تاباں اور سائل سے حکیم اجمل خاں کے بالکل برادرانہ تعلقات تھے۔ حکیم صاحب کے دیوان خانہ میں عام طور پر رات کے وقت مجلسِ احباب ہوتی تھی اس میں ہر دو حضرات اکثر شریک ہوتے تھے اور دیگر مشاغل و تبادلۂ خیالات کے ساتھ شعر و سخن کا شغل بھی ہوتا تھا۔ تاباں صاحب سے حکیم صاحب نے کچھ فارسی کلام میں اصلاح بھی لی تھی۔ تاباں داغ کے کلام کو بازاری کلام کہتے تھے اور اُن کے کلام کی تعریف سے چڑ جاتے تھے۔ حکیم صاحب گاہ گاہ اپنی مجلس میں یہ لطیف مذاق اس طرح کیا کرتے تھے کہ خود تو نہیں مگر کسی دوسرے شخص کو اشارہ کر دیتے تھے جو مجلس میں اس وقت تک داغ کے کلام کی تعریف کرتا جب تک تاباں مشتعل نہ ہو جاتے بالعموم آدابِ مجلس کے پابند تھے مگر جب مشتعل ہو جاتے تھے تو پھر کسی کا احترام

---

[1] یہ واقعات حضرت نوح ناروی سے معلوم ہوئے۔

ملحوظ نہ رہتا تھا جو مونھ میں آتا تھا برملا کہتے تھے۔ جس وقت یہ جنگ تاباں اور سائل دونوں بوڑھے بھائیوں میں واقع ہوتی تھی تو انسانی طاقت کا کام نہ تھا کہ ہنسی کو ضبط کر سکے ۔ ۱۹۱۳ء میں جبکہ حکیم صاحب تبدیل آب و ہوا کی غرض سے ادکھلہ میں قیام پذیر تھے یہ دونوں بھائی اور دیگر اراکینِ مجلس وہاں جمع ہو گئے۔ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد کچھ دیر مجلسِ مشاعرہ گرم رہی، احباب کی جانب سے ان کے بہترین طرز ادا اور معنوی خوبیوں پر دادِ سخن ہو رہی تھی اس دوران میں حکیم صاحب نے سائل صاحب کو اشارہ کیا، وہ حکیم صاحب کا منشا سمجھ گئے اور دو زانو ہو کر داغ کا کچھ کلام پڑھا اور مافوق العادت الفاظ میں تعریف کرنی شروع کی۔ تاباں صاحب کا پارہ چڑھنا شروع ہوا۔ پھر سائل صاحب نے بھائی کی طرف رُخ کر کے عرض کیا بھائی صاحب گستاخی معاف ہو داغ کی طرح شعر کہنا کوئی خالہ جی کا گھر تو نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت داغ نازک خیالی اور جذبات آفرینی میں اپنا نظیر نہ رکھتے تھے۔ اور قادر الکلام بھی ایسے تھے کہ ایک گھنٹہ میں پچاس شعر بلا تکلف لکھ لیتے تھے۔ بھلا تاباں میں اتنی تاب کہاں تھی کہنے لگے ابے مجھ کو شعر سمجھنے اور اس کو شعر کہنے کی لیاقت ہی کیا ہے۔ کیا قلم برداشتہ شعر کہنا ہی معیار سخندانی ہے۔ اگر یہی ہے تو مصرع کہہ۔ جناب سائل نے ادب کے ساتھ مصرع دیا۔ سنتے ہی ادنیٰ تامل کے ساتھ تاباں نے یہ شعر پڑھا ؎

شفق بن کر چڑھا ہے چرخ کے سر پر لہو میرا ۔۔۔ علاقہ میرا نہ تو میرا نہ چرخِ فتنہ جو میرا

شعر سنتے ہی مجلس پھڑک اٹھی۔ حکیم صاحب نے کھڑے ہو کر تاباں کو گلے لگا لیا۔ تاباں کا یہ حال تھا کہ فرطِ غضب سے آنکھیں سُرخ تھیں، مونھ سے کف جاری تھا، ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے، پنکھا جھلا گیا۔ پانی کے چھینٹے دیئے گئے، جب ذرا حواس بجا ہوئے تو بے تحاشا گالیاں دینی شروع کیں۔ سائل صاحب ہاتھ باندھے

سر جھکائے ہوئے سب کچھ سنتے رہے۔ جب تھک گئے تو کہنے لگے کہ اب زیادہ گالیاں دینے کی طاقت نہیں رہی لہذا چوٹی کی ایک گالی اور دیتا ہوں کہ شہاب الدین کے نطفہ سے یا میں نہیں یا تو نہیں [۵۱]

حکیم صاحب چونکہ خود بھی نہایت سخن فہم اور سخن سنج ادیب اور شاعر تھے۔ اس لئے ان دونوں حضرات کی بہت قدر کرتے تھے اور حقیقت تو یہ ہے کہ حکیم صاحب ہر اہلِ علم کے سچے قدر دان اور محب تھے۔

حضرت تاباںؔ کی شادی مرزا باقر علی خاں کاملؔ بن عارفؔ کی بڑی صاحبزادی محمد سلطان بیگم (عرف جندو بیگم) سے ہوئی تھی۔

کچھ عرصہ حیدرآباد میں بھی وظیفہ خوار رہے اور آخر میں مستقل طور پر دہلی میں رہنے لگے تھے۔ مہرولی میں اپنے دادا کے پائینتی اور چچا کے پہلو میں دفن ہوئے۔

آپ کی اہلیہ محترمہ حیات ہیں اور محلہ بلیماران میں سکونت پذیر ہیں۔ اولاد کوئی نہیں ہوئی۔ تاباںؔ کے انتقال کے بعد ان کی بیگم صاحبہ سے سائلؔ مرحوم کے کچھ خاندانی مناقشات اور عدالتی کشمکش بھی چلتی رہی اور یہ اختلاف آخر تک رہا مگر سائلؔ صاحب کے انتقال کے وقت جب بیگم تاباںؔ سے سائلؔ کو مہرولی میں دفن کرنے کی اجازت لی گئی تو انھوں نے نہایت فراخدلی سے اجازت دے دی اور فرمایا میرا اس کا اختلاف زندگی تک تھا اب کوئی اختلاف نہیں [۵۲]

مرزا بہاءالدین احمد خاں طلبؔ

نواب شہاب الدین احمد خاں ثاقبؔ کے منجھلے صاحبزادے مرزا بہاءالدین احمد خاں

---

۵۱ حیاتِ اجمل مصنفہ شفاء الملک ص۱۹۲ مصنف حیاتِ اجمل نے شہاب الدین کے بجائے ریاض الدین لکھا ہے یہ غلط ہے۔ ۵۲ اس واقعہ کے راوی محمد یعقوب خاں صاحب (ساکن کڑہ بجواڑیان محلہ بلیماران) ہیں۔

طلب تھے۔ بروز شنبہ ۳ شعبان ۱۲۷۹ھ مطابق ۲۴ جنوری ۱۸۶۳ء کو پیدا ہوئے۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں نے مادۂ تاریخ کہا (ابو الاعیان نور الدین علی خاں ۱۲۷۹ھ) ابتدا میں مرزا علی حسین خاں شاداںؔ اور میرزا عبد الغنی ارشدؔ سے استفادہ کرتے رہے دہلی میں پولیس انسپکٹر تھے۔ ان کی شادی زبیدہ بیگم سے ہوئی تھی۔ صرف ایک صاحبزادی محمود سلطان بیگم چھوڑیں جو سر ذوالفقار علی خاں کو منسوب ہیں۔ محمود سلطان بیگم کے دو صاحبزادے میرے علم میں رشید علی خاں، خورشید علی خاں اور دو صاحبزادیاں قدسیہ سلطان، قیصر سلطان ہیں۔ مرزا طلبؔ کا انتقال ریاست اجین میں ہوا۔ اور وہیں مدفون ہیں۔

مرزا امتیاز الدین احمد خاں مائلؔ

حضرت سائلؔ مرزا بہاء الدین سے چھوٹے اور ان سے چھوٹے مرزا امتیاز الدین احمد خاں مائلؔ تھے۔ مرزا عبد الغنی ارشدؔ سے اصلاح لیتے رہے۔ ان کا نکاح داغؔ کی سالی کی نواسی (لاڈلی بیگم) سے ہوا جو داغؔ کی مونھ بولی بیٹی ہیں۔ اُن کے صاحبزادے مرزا ناصر الدین عرف ناصر مرزا ہیں۔ مائلؔ صاحب کے انتقال کے وقت ناصر مرزا کی عمر تقریباً ۵ سال تھی۔ مائلؔ صاحب قدم شریف میں مدفون ہیں[1]۔

لاڈلی بیگم کے بیوہ ہو جانے کے بعد سائلؔ صاحب کی والدہ نے یہ مناسب سمجھا کہ گھر کے گھر میں ہی یہ رشتہ ہو جائے تو بہتر ہے۔ چنانچہ سلسلہ جنبانی کی گئی۔ ریاست نظام کا قانون یہ تھا کہ بیوہ کا نکاح ثانی ہو جانے پر اس کا منصب جو ریاست سے ملتا تھا، بند ہو جاتا تھا مگر عین عالمِ شباب میں بیوہ ہو جانے کے معاملہ کی نزاکت کو زیادہ اہمیت دی گئی۔ حضرت سائلؔ صاحب اپنی پہلی بیوی (ننھو بیگم) کو

---

[1] صحیفۂ زریں ۲۵ مائلؔ کا جو کلام دستیاب ہو سکا وہ نواب خسرو مرزا نے شائع کر دیا ہے۔

طلاق دے چکے تھے بنا بریں ان کے ساتھ نکاح کر دیا گیا۔ ادھر حضور نظام کو داغ صاحب نے لکھا کہ خادم زادی جو ممتاز الدین احمد خاں کی بیوہ ہے چونکہ عالمِ جوانی میں بیوہ ہو گئی ہے اس لئے معاملہ کی نزاکت کو محسوس کر کے اس کے جیٹھ سراج الدین احمد خاں سائل سے اس کا نکاح کر دیا گیا ہے۔ اس کے منصب کے بارے میں جو کچھ بزرگانِ عالی کا حکم ہو وہ تسلیم ہے۔"

حضور نظام نے تمام ممالکِ محروسہ میں حکم جاری کر دیا گیا کہ بیوائیں اپنا نکاحِ ثانی کر سکتی ہیں ان کا منصب جاری رہے گا۔ یہ امر حضور نظام کی غربا پروری اور خاص کر استاد نوازی کی ادنیٰ مثال ہے۔ حضرت داغ کے معاملہ میں حضور نظام جس فراخدلی اور عزت افزائی کا ثبوت دیتے تھے اس کو شیفتگی اور عشق کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔

یہ نکاحِ ثانی ۱۹۰۱ء میں ہوا۔ اس وقت سائل صاحب کی عمر تقریباً ۳۴ سال اور بیگم صاحب کی عمر تقریباً ۱۹ سال تھی۔ مرزا ناصر الدین نے سائل صاحب کی سرپرستی میں تعلیم و تربیت حاصل کرنی شروع کی۔ جب حضرت داغ کا ۱۹۰۵ء میں انتقال ہوا تو کچھ عرصہ کے بعد سائل صاحب مع اہل و عیال کے دہلی چلے آئے۔

نواب شہاب الدین احمد خاں کی صاحبزادی جو اپنے چاروں بھائیوں سے چھوٹی تھیں جن کا نام اختری بیگم تھا یہ نواب سر امیر الدین احمد خاں (عرف فرخ مرزا) بن نواب علاء الدین احمد خاں کو منسوب تھیں[1]

میرے علم کے مطابق ان کے چار صاحبزادے اور چار صاحبزادیاں ہیں۔ نواب معز الدین اکبر مرزا (جن کی ولادت ۱۸۶۵ء اور وفات ۱۹۳۰ء میں ہوئی)، نواب اعز الدین اعظم مرزا (جن کی ولادت ۱۸۸۹ء کی ہے اور وفات ۱۳۴۵ھ قدم شریف

---

[1] یہ حالات میں نے کچھ اپنی سابقہ معلومات سے اور کچھ محترمہ استانی صاحبہ سے دریافت کر کے لکھے ہیں۔

میں مدفون ہیں) نواب اعزاز الدین شاہرخ مرزا (جن کی ولادت ۱۸۸۷ء کی ہے)۔
نواب اعتزاز الدین ہمایوں مرزا موجودہ فرمانروائے ریاست لوہارو (نواب امین الدین احمد خاں ثانی نواب اعز الدین اعظم مرزا کے خلف رشید ہیں۔

فخری بیگم زوجہ نواب مانگرول، بلقیس بیگم زوجہ نواب احمد نواز خاں ڈیرہ اسمٰعیل خاں، شہر بانو بیگم زوجہ نواب ابراہیم علی خاں نواب پاٹودی، مہر بانو بیگم زوجہ نواب قطب الدین خاں ممدوٹ۔

نواب افتخار علی خاں موجودہ والی پاٹودی نواب ابراہیم علی خاں کے بیٹے ہیں۔

یہ جناب سائل صاحب کی بھانجی شہر بانو بیگم کے صاحبزادے ہونے کے لحاظ سے سائل صاحب کے نواسے ہوتے ہیں۔ اختری بیگم زوجہ نواب سراج الدین کا انتقال محرم ۱۳۲۹ھ میں ہوا۔ قدیم شریف میں دروازے کے دائیں جانب اونچے چبوترے پر مدفون ہیں۔

نواب ابو المعظم مرزا سراج الدین احمد خاں سائل کی ولادت

کس کو معلوم تھا کہ اس دودمانِ عالی کی روایات کو زندہ رکھنے کے لئے ایک ایسا گوہرِ نایاب ظاہر ہونے والا ہے جس کی آب و تاب سے ایوان مجد و شرافت اور قصر شعر و سخن جگمگا اٹھے گا اور کس کو معلوم تھا کہ اجڑی ہوئی دلّی میں ایک ایسا ماہتاب طلوع ہوگا جو دہلی کی تاریخی تہذیب و تمدن متانت و شائستگی کو اپنے دامن میں لئے ہوئے تمام ہندوستان کو روشن کر دے گا اور جو صحیح طور سے نیر رخشاں کا جانشین اور نمونہ ہوگا۔

جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے دس سال کے بعد مورخہ ۲۰ شوال ۱۲۸۰ھ م ۱۸۶۷ء کو نواب ضیاء الدین احمد خاں کے گھر پوتا پیدا ہوا اور اس شہسوار میدانِ سخن

نے مغل تاجدار کی ہمنامی کا شرف حاصل کیا یعنی مرزا سراج الدین احمد خاں نام پایا۔
کلیاتِ غالب فارسی میں ایک قطعہ ہے :۔

درخشید از سپہرِ جاہ ماہے　　بفرخ طالع و فرخندہ ہنگام
زہے چشم و چراغِ دودۂ حسن　　کہ افزاید فروغِ دین اسلام
سراج الدین احمد خاں بہادر　　نہادند اختر رخشندہ را نام
ہمیں نام ست تاریخِ ولادت　　خوشا نام آور و شائستہ فرجام
خدایا اندریں گیتی کہ آں را　　نداند جز تو کس آغاز و انجام
رسد تا قطرہ زن ابر از پئے باد　　شود تا جلوہ گر صبح از پس شام
نگہدار ایں ہمایوں نامور را　　نشاں مند نشاط و عیش و آرام

مرزا غالب کے قطعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ "سراج الدین احمد خاں بہادر" مادۂ تاریخ ہے۔ مرزا غالب کے مصرع سے اعداد ۱۲۷۵ نکلتے ہیں۔ بقول حضرت سائل صاحب ان کا مادۂ تاریخ ولادت "مرزا سراج دین احمد خاں" ہے جس سے تاریخ ولادت ۱۲۸۰ھ نکلتی ہے۔ لہٰذا یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ قطعہ جناب سائل مرحوم کی ولادت کے موقع پر کہا گیا ہے۔ ہاں اگر مرزا غالب کے مصرع کے بجائے یوں پڑھا جائے "سراج دین احمد خان مرزا" تو مصرع تاریخ ہو جائے گا۔ یہی وہ ہونہار اور کریم بن الکریم تھا جو نشو و نما پاکر سائل بنا اور دہلی کی شرافت و تہذیب اور شعر و سخن کی دولت تقسیم کی۔ ابھی پانچ سال کی عمر تھی کہ والد محترم نواب شہاب الدین احمد خاں ثاقب کا ۱۲۸۶ھ میں انتقال ہو گیا اور جب ۲۲ سال کی عمر ہوئی تو شفیق دادا نے بھی مونھ موڑا۔

سلسلۂ نسب یوں ہے :۔ نواب سراج الدین احمد خاں سائل بن نواب شہاب الدین احمد خاں ثاقب بن نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر رخشاں بن نواب

احمد بخش خاں جاگیر دار ریاست لوہارو بن عارف جان بن خواجہ ضیاء جان بن خواجہ نعمت اللہ بن خواجہ عبدالرحمن[1]۔ یہ سلسلۂ نسب خواجہ احمد یسوی سے جا ملتا ہے جو مشائخِ کبار میں سے تھے۔

نواب ضیاء الدین احمد خاں کی نگرانی میں تعلیم و تربیت شروع ہوئی اور فارسی کی درسیات نواب مرحوم سے سبقاً سبقاً پڑھیں[2]۔ مولوی قاسم علی اتالیق مقرر ہوئے ان سے بھی درسیات پڑھیں[3] اور عربی کی ابتدائی کتابیں مولانا ڈپٹی نذیر احمد سے پڑھیں[4]۔ فنی کتب علم عروض و گرامر وغیرہ مرزا عبدالغنی ارشد گورگانی سے پڑھیں اور کلام کی اصلاح لی اور حکیم عبدالمجید خاں سے حکیم اجمل خاں کے ساتھ طب کی کچھ ابتدائی کتابیں بھی پڑھیں۔

مولانا نذیر حسین صاحب محدث دہلوی[5] المتوفی ۱۳۲۰ھ (جو ابتداءً پنجابی کٹرے کی مسجد اورنگ آبادی میں درسِ حدیث دیتے تھے اور ۱۸۵۷ء میں پنجابی کٹرے کے برباد ہو جانے پر پھاٹک حبش خان میں اُن کا فیض جاری رہا)، سائل صاحب نے ان کے حلقۂ درس میں شریک ہو کر حدیث کی سماعت بھی کی ہے۔ خوشنویسی کی مشق نواب مولوی رضی الدین احمد خاں دہلوی شاگرد میر پنجہ کش دہلوی سے کی اور ایسا کمال پیدا کر لیا کہ اس شان کا خط کہیں دیکھنے میں نہیں آیا۔ تخلص کے بارے میں نواب احمد سعید خاں طالب (عم محترم حضرت سائل صاحب) اور دیگر حاضرینِ مجلس ایک روز سرگرمِ فکر تھے۔ اس اثناء میں ایک شریف اور سوالی صورت انسان نے آ کر سلام کیا۔ تشریف آوری کا سبب معلوم کرنے پر آنے والے صاحب نے عرض کیا کہ "سائل ہوں"۔ چنانچہ اسی لفظ سائل کی طرف توجہ منعطف ہوئی۔ قرعہ ڈالا گیا اور

---

[1] از یادداشت قلمی مرزا البشیر الدین احمد خاں بتوسط نواب خسرو مرزا۔ [2] خمخانۂ جاوید [3] اوراقِ گل۔
[4] واقعاتِ دار الحکومت دہلی جلد دوم صفحہ ۱۹۸ [5] حیاۃ النذیر و غالب از مہر۔

جواب حسبِ مراد حاصل ہوا۔[۵۱]

تاجِ ارشدؔ، جامِ غالبؔ، ماہِ داغؔ سائلؔ اندر کاسہ دارد سرِ چراغ

ایک عجیب و غریب واقعہ اپنے بچپن کا راقم الحروف کو سنایا کہ جب میری عمر چار پانچ برس کی تھی دادا مرحوم کے پاس ایک ماہر جوتشی کسی غرض سے آیا تھا اس نے مجھے کئی مرتبہ غور سے دیکھا۔ دادا نے دریافت کیا کہ کیا بات ہے اس بچّہ کو آپ حیرت آمیز نگاہوں سے کیوں دیکھ رہے ہیں۔ اس نے کہا کہ یہ بچہ بڑا ہو کر جھوٹ پہ فخر کرے گا تمام حاضرین کو تعجب ہوا اور جوتشی کی بات کو لغو سمجھا گیا۔ دس بارہ برس کی عمر سے شعر کہنا شروع کیا اور شعر و سخن سے دلچسپی بڑھتی ہی گئی۔

سائلؔ صاحب دہلی میں مرزا عبدالغنی ارشدؔ گورگانی سے اصلاح لیتے رہے ارشدؔ فیروزپور میں ملازم تھے اور آخر عمر میں کچھ علالت اور ضعف کی وجہ سے ترکِ ملازمت کر کے ملتان میں اپنے بڑے صاحبزادے مرزا بلند اختر رشیدؔ کے پاس چلے گئے تھے اور وہیں ۱۹۰۶ء میں انتقال کیا۔ ادھر یہ صورت پیش آئی کہ سائلؔ صاحب حیدرآباد چلے گئے اور تقریباً ۱۹۰۰ء میں داغؔ مرحوم کے شاگرد ہو گئے۔[۵۲]

اساتذہ حضرت سائلؔ

اس سلسلہ میں مناسب ہو گا کہ حضرت سائلؔ کے اساتذہ کے کچھ مختصر حالات بھی پیش کر دوں۔ اساتذہ میں سے وہ اساتذہ جن سے زیادہ استفادہ کیا ہے چار ہیں۔ نواب ضیاءالدین احمد خاں، مولوی قاسم علی، مرزا عبدالغنی ارشدؔ، فصیح الملک جناب داغؔ۔ اول الذکر تو جد محترم تھے اور خاندانی سلسلہ میں ان کا ذکر

---

۵۱ تخلص کا واقعہ محب محترم نہال سیوہاروی کے ایک مضمون سے لیا گیا ہے۔

۵۲ بقول حضرت نوحؔ ناروی مدظلہم العالی۔

مفصل آچکا ہے۔ مولوی قاسم علی صاحب کے حالات مجھے معلوم نہ ہو سکے۔ البتہ ارشد مرحوم اور زاغ مرحوم کے مختصر حالات پیش کرتا ہوں۔

مرزا عبدالغنی ارشد گورگانی

بارہ دری خواجہ میر درد کوچہ چیلان میں ارشد مرحوم کی سکونت تھی۔ اب ان کی اولاد یہیں سکونت پذیر ہے۔ ان کے پوتے مسٹر رضی الدین راقم کے خاص محب اور مخلص دوست ہیں۔

ارشد مرحوم نواب کاشفہ سلطان بیگم بنت ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ کے نواسے تھے۔ سلسلۂ نسب یہ ہے صاحب عالم مرزا عبدالغنی ارشد گورگانی بن مرزا علی بہادر بن شہزادہ دلاور شاہ بن حضرت احمد شاہ بادشاہ ابن حضرت محمد شاہ بادشاہ آپ کی پیدائش قلعۂ معلیٰ میں ہوئی۔ چھ سات برس کی عمر میں ہنگامہ ۱۸۵۷ء پیش آیا اور پھر آپ دہلی میں رہے وہیں درسی کتابیں پڑھیں اور سررشتۂ تعلیم پنجاب میں ملازم ہو گئے۔ کچھ عرصہ لاہور میں قیام رہا پھر زیادہ عرصہ فیروزپور میں جہاں آپ فارسی کے ہیڈ مولوی تھے، بسر ہوا۔ شاعری کی ابتدا بچپن سے ہو گئی تھی۔ مرزا قادر بخش صابر مرحوم رشتے میں آپ کے ماموں ہوتے تھے۔ انھیں علاوہ زبردست استعداد عربی و فارسی علم عروض پر ایسا عبور تھا کہ اس فن میں مستند سمجھے جاتے تھے اور فن شعر میں بھی مسلم الثبوت اُستاد تھے۔ صابر مرحوم کے بڑے صاحبزادے مرزا عمر سلطان معروف بہ مرزا قیصر بخت فروغ بنارس میں شادی ہو جانے کے باعث ڈپٹی وہاں کے انسپکٹر مدارس بھی تھے) بنارس میں رہتے تھے۔ اگرچہ مرزا صابر بھی وہاں آتے جاتے تھے مگران کا زیادہ تر قیام دہلی میں رہتا تھا۔ مرزا ارشد سے انھیں خاص اُنس تھا۔ ان کی ذکاوت تیزی اور رسائی فکر کو دیکھ کر جان گئے کہ خدا نے اسے غیر معمولی دماغ

دیا ہے اور قابلِ تربیت پا کر ان کی تربیت اور اصلاح میں کوشاں ہوئے پھر کیا تھا ابتدا ہی میں ایسے شعر نکلنے لگے کہ اُستاد پھڑک گئے۔ ابتدائی زمانہ میں بھی یہ حال تھا کہ ایک غزل سو ڈیڑھ سو شعر کی کہہ دیتے تھے۔ اور ایک قافیہ کو بیس بیس طرح باندھتے تھے۔ یہ طالب علمی کے زمانہ کی کیفیت ہے کہ مدرسہ میں اور لڑکے جس سبق کو گھنٹوں رٹتے یہ چند منٹ کی توجہ میں یاد کر لیتے اور ہمیشہ جماعت میں اعلیٰ رہتے۔ اس اثنار میں مرزا صابر بنارس تشریف لے گئے اور چند ہی روز اصلاح کا سلسلہ جاری رہا۔ وہاں سے لکھ بھیجا کہ اب تم بجائے خود اُستاد ہو تمھیں اصلاح کی احتیاج نہیں۔ مرزا صابر مرحوم ان پر ناز کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ساری عمر کی کمائی دو شاگرد ہیں ارشد اور فروغ۔

مرزا صابر کے بعد چند سبق مولوی احسان الرحمٰن خاں معروف بہ منجھلے آغا سے لیے پھر انھیں کی تحریک سے امراؤ مرزا انور کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ تکمیلِ فارسی کے بعد پہلا قصیدہ عرفی کے قصیدہ (دہان علم زبان علم) پر لکھا اور خواجہ حالی کے ہمراہ نواب ضیاء الدین احمد خاں نیرّ رخشاں کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انھوں نے سن کر بہت داد دی۔ جب تک دہلی میں رہے سیف الحق ادیب، مرزا حسین علی خاں شاداں (شاگرد غالب مرحوم) مرزا انور، مرزا فروغ، مرزا داغ کے ساتھ مشاعروں میں غزلیں پڑھتے رہے اور کسی سے کم نہیں رہے۔ ایک خصوصیت یہ تھی کہ جیسا اچھا کہتے تھے ویسا ہی اچھا پڑھتے بھی تھے۔ جملہ اصنافِ سخن پر قادر ہونے کے علاوہ طبیعت ہر وقت حاضر رہتی تھی۔ تاریخ میں بھی ملکہ حاصل تھا۔ کوئی خاص وقت فکرِ سخن کے لئے متعین نہ تھا۔ جس وقت چاہتے تھے اور جس مضمون پر لکھنا ہوتا قلم برداشتہ تھوڑی ہی دیر میں بہت کچھ لکھ ڈالتے تھے۔ اکثر جلسوں کے لئے طویل نظمیں ریل کے سفر میں لکھ لیتے تھے۔ ایک اور قابلِ حیرت بات یہ ہے کہ جس طرح قدیم ذوقِ شاعری

رکھتے تھے اسی طرح جدید نیچرل شاعری میں بھی کسی سے کم نہ تھے۔ ہمیشہ خوش رہتے اور دوستوں کو خوش رکھتے۔ زندہ دلی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ سرکار بہاولپور سے بہ صلۂ مدح گستری دو سو روپے سالانہ آپ کو ملا کرتا تھا۔ انجمن اسلامیہ لاہور کے سالانہ جلسوں میں پندرہ سال تک برابر شریک ہو کر سامعین کو محظوظ فرماتے رہے۔ جن بزرگوں کی کوشش سے پنجاب میں اردو کی اشاعت ہوئی اُن میں آپ درجۂ اختصاص رکھتے ہیں۔

مرزا صاحب سال بھر سے زیادہ سے علیل رہنے لگے تھے۔ چنانچہ رخصت لے کر دہلی گئے مگر تھوڑے ہی دنوں بعد پھر فیروزپور جانا پڑا۔ آخر اپنے بڑے بیٹے مرزا بلند اختر رشید کے پاس جو ملتان میں ریلوے کے دفتر میں نقشہ نویس تھے چلے گئے اور وہیں ۵۸ برس کی عمر میں ۱۲ر فروری ۱۹۰۶ء کو انتقال کیا۔

آپ کے تلامذہ تو بکثرت تھے مگر ہم چند ناموں پر اکتفا کرتے ہیں۔ نواب سراج الدین احمد خاں سائل، نواب ممتاز الدین احمد خاں مائل، منشی احمد حسین خاں احمد، ڈاکٹر محمد اقبال، البشیر، بزمی گورگانی[۱]

فصیح الملک داغ دہلوی

فصیح الملک نواب محمد مرزا خاں داغ، احسن مارہروی کی تحقیق کے مطابق نواب شمس الدین احمد خاں رئیس لوہارو و فیروزپور جھرکہ کے فرزند ہیں اور نواب شہاب الدین احمد خاں ثاقب کے چچازاد بھائی۔ اسی وجہ سے حضرت سائل مرحوم ان کو چچا جان کہتے تھے۔

جناب داغ مورخہ ۱۲ر ذی الحجہ ۱۲۴۶ھ مطابق ۲۵ر مئی ۱۸۳۱ء روز چہار شنبہ

---

[۱] خمخانۂ جاوید جلد اوّل۔ کلام کا انتخاب بھی خمخانہ میں ہی ملاحظہ فرمائیے۔

محلہ بلیماران دہلی میں پیدا ہوئے۔ چھ برس کی عمر تھی کہ نواب صاحب کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ پھر ان کی والدہ نے آخری مغل بادشاہ کے ولیعہد فتح الملک مرزا فخر الدین عرف مرزا فخرو کے دامنِ عاطفت میں پناہ لی اور نواب شوکت محل کا خطاب پایا۔ اس طرح داغ کو قلعۂ معلّیٰ میں علوم و فنون کی تکمیل کا عمدہ موقع مل گیا۔ یہ غالباً ۱۸۴۴ء میں ہوا۔

ابتدائی تعلیم مولوی غیاث الدین رامپوری مؤلف غیاث اللغات سے حاصل کی اور قلعۂ معلّیٰ میں مولوی سید احمد حسین بن میر غلام حسین شکیبا جو میر تقی کے تلمیذ تھے داغ کے اتالیق مقرر ہوئے۔ خوشنویسی میر پنجہ کش اور ان کے شاگرد مرزا عبداللہ بیگ سے حاصل کی۔ فنونِ سپہ گری ولی عہد بہادر سے حاصل کیے۔ ان کی طباعی اور ذہانت سے متاثر ہو کر ان کو استاد ذوق کے سپرد کیا گیا تاکہ دیگر فنون کی طرح شعر و سخن کا کمال بھی حاصل کریں۔ داغ کا بچپن اور عنفوانِ شباب کا زمانہ قلعۂ معلّیٰ میں ہی بسر ہوا۔ اور وہیں کی ادبی فضا میں پرورش پائی۔ مشاعروں میں شریک ہوتے رہے۔ ولیعہد کی وجہ سے بالعموم لوگ ان کا احترام کرتے تھے۔

مرزا خورشید عالم بن ولی عہد مرزا فخرو داغ صاحب کی والدہ کے بطن سے تھے اور حیدر آباد کے قیام کے زمانہ میں مرزا خورشید عالم بھی حیدر آباد میں تھے۔ ۱۸۵۶ء میں ولیعہد کا انتقال ہو گیا۔ داغ کو اس حادثہ کا سخت صدمہ ہوا۔ اس کے دس ماہ بعد ہنگامہ ۱۸۵۷ء پیش آیا اور ۲۴ برس کا زمانہ جو عافیت کے ساتھ گزرا تھا ختم ہوا۔ داغ اپنے اہل و عیال کے ساتھ رامپور چلے گئے۔ نواب یوسف علی خاں والیٔ رام پور نے قدر دانی کی اور اپنے صاحبزادے نواب کلب علی خاں کا مصاحب مقرر کیا۔ نواب کے انتقال کے بعد نواب کلب علی خاں نے بھی اپنا وہی طرزِ عمل رکھا اور اپنا معتمد خاص مقرر کیا۔

دہلی میں جب نواب یوسف علی خاں مرزا فخرو ولی عہد کے مصاحب تھے تو داغ اور کلب علی خاں کا بچپن کا زمانہ ساتھ ہی گذرا تھا۔ اس تعلق کو نواب نے آخر تک نباہ دیا۔ نواب کلب علی خاں کے انتقال کے بعد ۱۸۸۶ء میں کونسل کا تقرر ہوا۔ جنرل اعظم الدین خاں سے ان کی نہ بنی اور رامپور کو خیرباد کہہ کر دہلی چلے آئے۔ پھر ۱۳۰۵ھ مطابق ۱۸۸۸ء میں حیدرآباد چلے گئے۔ چند روز محلہ شیدی عنبر میں سیف الحق ادیب دہلوی کے ہاں اور پھر ان کے متصل ایک مکان میں مقیم ہوئے۔ راجہ گردھاری پرشاد بہادر عرف بنسی راجہ باقی کی معرفت بیش گاہ سلطانی میں عرضی بھیجی پہلا قصیدہ مدحیہ جو آپ نے میر محبوب علی خاں نظام دکن کی شان میں لکھا اس کا مطلع یہ ہے:۔

میں ہوا بادیہ پیما طرفِ ملکِ دکن   سرمۂ چشمِ غزالاں ہوئی گردِ دامن

پھر دلّی چلے آئے اور نواب موصوف کی طلبی پر دوسری بار حیدرآباد گئے۔ ۱۳۰۸ھ نظام نے اپنا استاد مقرر کیا۔ ۱۳۱۱ھ تک ساڑھے چار سو روپئے تنخواہ ملتی رہی۔ پھر ۱۳۱۲ھ میں ایک ہزار روپے ماہوار ہوگئی اور آخر عمر میں پندرہ سو روپے حالی ہوگئی تھی۔

داغ مرحوم نے حیدرآباد میں ۱۸ برس نہایت عزت و احترام اور آرام و راحت کے ساتھ گذار کر ۹ ذی الحجہ ۱۳۲۲ھ مطابق ۱۷ فروری ۱۹۰۵ء کو آٹھ روز مرض فالج میں مبتلا رہ کر بعمر ۷۶ سال رحلت فرمائی اور عید کے دن نماز عید کے بعد مکہ مسجد میں نماز جنازہ پڑھائی گئی۔ پھر یوسف صاحب شریف صاحب کی درگاہ میں دفن کیے گئے اسی درگاہ میں داغ صاحب کی اہلیہ اور حضرت امیر مینائی مرحوم بھی مدفون ہیں[1]۔

داغ بلند قامت تھے اور جثہ قد کے مناسب تھا، پیشانی بلند، آنکھیں بڑی بڑی، ناک اونچی اور انگلیاں موٹی موٹی تھیں۔ رنگ قدرے سیاہ تھا، چہرے پر

---

[1] جلوۂ داغ - داغ از نور اللہ (وغیرہ)

چیچک کے نشان تھے۔ مزاج میں شوخی، طبیعت میں روانی و بذلہ سنجی تھی۔ آدابِ شاہی سے تمام و کمال واقف بلکہ بعض امور میں تو انتہا درجہ کے نکتہ شناس تھے۔ اور کیوں نہ ہوتے قلعہ معلّٰی کے تربیت یافتہ تھے۔ دربارداری کی مہارت اور نواب کی مزاج شناسی کا یہ نتیجہ تھا کہ نواب نے بیحد قدر افزائی کی۔ ایک مرتبہ نواب نے رقعہ بھیجا جس میں یہ دریافت کیا کہ آپ کے تمام شاگردوں میں بہتر کون سا شاگرد ہے اس کے جواب میں انھوں نے کچھ لکھ کر بھیج دیا۔ حاضرین میں سے کسی کو دریافت کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ بعد میں کسی ذریعہ سے دریافت ہوا کہ آپ نے اس کا جواب یہ دیا کہ میرے تمام شاگردوں میں آپ سے بہتر کوئی شاگرد نہیں۔ معاذاللہ غضب کی فطانت، حاضر جوابی اور حاضر دماغی تھی۔

نواب کی غزل کی اصلاح میں بھی ایک خاص روش تھی جس سے ان کی آداب شناسی کی مہارت کا اندازہ ہوتا ہے۔ یعنی نواب کے الفاظ کو قلم زد نہ کرتے تھے بلکہ اپنا لفظ نیچے لکھ دیتے تھے۔

شعر اتنی جلدی کہتے تھے کہ حیرت ہوتی تھی۔ رامپور میں جبکہ مشاعروں کا اہتمام انھیں کے سپرد ہوتا تھا۔ انتظامی مصروفیت کے باعث غزل کہنے کا وقت نہ ملتا تھا۔ جب مشاعرے کا وقت قریب آجاتا اور تمام انتظامات مکمل ہو جاتے تھے تو الگ کسی کمرے میں کسی شاگرد کو لے کر بیٹھتے۔ شعر لکھواتے جاتے غزل مکمل ہو جاتی۔

کلکتہ کے سفر میں عظیم آباد میں بھی کچھ دنوں میر باقر حسین کے مکان پر قیام کیا تھا۔ عظیم آباد کے احباب نے گیارہ مصرعے مختلف زمینوں کے تجویز کر کے دیئے گیارہ اشخاص کو ایک قطار میں بٹھا دیا گیا۔ ہر شخص کو باری باری سے ایک ایک شعر لکھواتے جاتے تھے۔ اس طرح ایک مجلس میں گیارہ غزلیں تیار ہو گئیں۔[۵۱]

---

۵۱ یہ حالات مجھ کو حضرت نوح ناروی سے معلوم ہوئے۔

داغ کے چار دیوان گلزار داغ، آفتاب داغ، مہتاب داغ، یادگار داغ اور ایک مثنوی فریاد داغ ہے۔ گلزار داغ پر نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر کی تقریظ بھی ہے جو نواب ضیاء الدین احمد خاں کے حالات میں نقل کر چکا ہوں۔

مشہور شاگرد یہ ہیں۔ سائل دہلوی، بیخود دہلوی، نوح ناروی، سیماب اکبر آبادی، احسن مارہروی، آغا شاعر دہلوی، حسن بریلوی، بیباک شاہجہانپوری فیروز رامپوری، اختر نگینوی، عزیز حیدرآبادی، ڈاکٹر سر محمد اقبال، ذکیر مارہروی جوش ملسیانی، بیخود بدایونی، ہجر شاہجہانپوری، مبارک عظیم آبادی، مولانا محمد علی جوہر۔

ہندوستان میں ایسا کوئی استاد شاید ہی گذرا ہو جس کے شاگردوں کی تعداد ہزاروں تک جا پہنچی ہو۔ سنا ہے کہ تقریباً ڈھائی ہزار شاگرد تھے۔

جناب نوح ناروی نے ایک مرتبہ عرض کیا کہ حضور میدان حشر میں تو آپ کی ایک مستقل امت آپ کے پیچھے چلے گی۔ استاد نے فرمایا کہ جس امت میں نوح جیسے پیغمبر بھی ہوں اس امت کے کیا کہنے ہیں۔

نوح ناروی کا نمبر ایک ہزار پانچ تھا۔ آپ ۱۸۹۶ء میں داغ کے شاگرد ہوئے تھے۔ داغ نے کوئی اولاد نہیں چھوڑی۔ ان کی اہلیہ اُن کی زندگی میں ہی انتقال کر چکی تھیں۔

حضرت استاد کا قیام حیدرآباد

اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ حضرت سائل تقریباً ۱۹۰۰ء میں حیدرآباد تشریف لے گئے اور حضرت داغ کے شاگرد ہو گئے۔ ان کے خاندان کے بعض افراد ان کی اس شاگردی سے متنفر تھے۔ سائل صاحب نواب ضیاء الدین احمد خاں کے پوتے تھے جو مرزا غالب کے خاص شاگرد اور خلیفۂ اول تھے۔ ان کی شاعری کا رنگ غالب

سے ملتا جلتا تھا۔ یعنی تخییل کی بلندی، معنی آفرینی، اختراعِ تراکیب اور دیگر خصوصیات غالب ان میں بدرجۂ اتم پائی جاتی تھیں۔ وہی رنگ بعد کے آنے والے افراد خاندان یعنی چچا، نواب احمد سعید خاں طالب اور بڑے بھائی نواب شجاع الدین خاں تاباں وغیرہم کا بھی تھا۔ سائل صاحب کے پہلے اُستاد مرزا عبدالغنی ارشد کے ہاں بھی تقریباً یہی رنگ تھا مگر داغ کے ہاں محاکات و محاورات اور زبان تھی۔ یہاں رنگ ہی کچھ اور تھا۔ یہ وجہ تھی کہ سائل کے تلمذِ داغ کو اُن کے خاندان میں پسند نہ کیا گیا۔ تاباں صاحب تو صاف طور پر داغ مرحوم کے کلام کو بازاری کلام کہا کرتے تھے۔

اس شاگردی کے بعد سائل کے رنگ میں تغیر واقع ہوا۔ اختراعِ تراکیب کی جگہ محاورہ و زبان اور معنی آفرینی کی جگہ محض زود گوئی کی طرف رُجحان ہوا۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر مرزا عبدالغنی ارشد کے بعد دوسرا استاد بھی ارشد ہی جیسا مل جاتا تو آج دنیائے ادب کو مرزا غالب کا نظیر تلاش کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ مگر باوجود اس کے سائل کی فکرِ رسا نے اپنے خاندانی رنگ اور داغ کے رنگ کو سمو کر ایک ایسا رنگِ تغزل ایجاد کر لیا جو مومن کے قریب قریب تھا۔ اُن کے کلام میں شوخی بھی ہے، تصوّف بھی ہے، معنوی بلند پروازی بھی ہے، شوکتِ الفاظ بھی ہے، محاورہ بھی ہے، زبان بھی ہے۔ غرضکہ اعتدال کے ساتھ وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو مومن کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔ باوجود ان کمالات کے زود گوئی اور حاضر دماغی کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ علامہ رحمت بلند شہری لغرضِ ملاقات دہلی میں سائل صاحب کے دولت خانہ پر گئے۔ چند احباب کے حلقہ میں سائل صاحب تشریف فرما تھے اور تاش کی بازی شروع ہو رہی تھی۔ سوال ہوا کہ پہلی چال کس کی ہے؟ ساتھ ہی سائل صاحب نے ایک شعر پڑھتے ہوئے پتہ پھینکا۔

عشق بازی نہ سہی تاش کی بازی ہی سہی　　　کاٹتا کون ہے ہم دیتے ہیں سر دیکھیں تو

تاش کی بازی بھی جاری تھی اور نووارد مہمان سے رسمی گفتگو اور اظہارِ اخلاص و مدارات میں بھی کوئی کمی نہ تھی۔

حیدر آباد میں بعض لوگوں نے یہ بات اڑائی کہ سائل کو داغ غزل کہہ کے دیتے ہیں۔ جب یہ خبر سائل صاحب تک پہنچی تو انھوں نے مشاعروں میں جانا چھوڑ دیا۔ آخر ایک مرتبہ کسی بڑے مشاعرے میں جس میں داغ بھی شریک تھے ان کو زبردستی کھینچا گیا۔ انھوں نے اس شرط پر شرکت قبول کی کہ کوئی مصرع سرِ مشاعرہ دیا جائے اور مشاعرے میں ہی سب کے سامنے غزل لکھ کر پڑھوں۔ چنانچہ داغ نے مصرع دیا سائل نے غزل کہہ کر پڑھی۔ اس غزل کا ایک شعر یہ ہے :۔

کرتے ہیں بات بات میں وہ دل لگی کی بات　　　مطلب اڑائے دیتی ہے سارا ہنسی کی بات[۱]

اس میں شک نہیں کہ سائل زود گوئی میں داغ سے کم نہ تھے۔ چنانچہ حکیم اجمل خاں کی محفلوں میں بھی اکثر سائل کے اس کمال کا اظہار ہوا ہے۔ مگر جو کلام محض زود گوئی کی مہارت کے اظہار کے لئے کہا گیا ہو اس میں زبان و محاورہ کے علاوہ کسی اور چیز کی آمد مشکل ہوتی ہے۔ فرمائشیں اور وقتی ضرورتیں شاعری کی مٹی پلید کر دیتی ہیں۔ یہ سائل کی خصوصیت ہے کہ ایسی فرمائشی اور وقتی غزلوں میں بھی زبان کی چاشنی اور بندش کی چستی بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔

رسالہ معیار الانشاد

اسی زمانہ میں سائل نے حیدر آباد سے رسالہ 'معیار الانشاد' جاری کیا جو

---

[۱] یہ واقعہ محبِ محترم مولوی محمد حسن صاحب اختر تلمیذ حضرت سائل نے مجھ سے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ مجھ سے خود استاد مرحوم نے بیان کیا تھا۔

تقریباً ۱۹۰۸ء تک جاری رہا۔ اس رسالہ میں ایک مصرعِ طرح آئندہ نمبر کے لئے شائع کر دیا جاتا تھا اس پر داغ کے شاگرد طبع آزمائی کر کے سائل کے پاس اپنی غزلیں بھیج دیتے تھے۔ سائل صاحب مختلف اوقات میں اُستاد کو دکھا کر تمام غزلیں رسالہ میں شائع کر دیا کرتے تھے۔ داغ صاحب کے انتقال کے بعد یہ رسالہ کچھ عرصہ تک تو جاری رہا مگر حالات کے نامساعد ہو جانے کی وجہ سے آخر بند ہو گیا۔

حیدر آباد میں سائل مع اپنے اہل و عیال کے اسی کوٹھی میں رہتے تھے جہاں اُستاد داغ قیام پذیر تھے۔ یہ کوٹھی ترپ بازار میں عابد شاپ کے متصل واقع تھی اس کا کرایہ حضور نظام خود ادا کیا کرتے تھے۔ سائل صاحب اوپر کی منزل میں رہتے تھے۔ اس زمانہ میں سائل صاحب اور ان کی بیگم صاحبہ اور مرزا ناصر الدین کے (جو سائل صاحب کے بھتیجے اور سوتیلے بیٹے ہیں) وظائف کی آمدنی تقریباً دس گیارہ سو روپے ماہوار ہو جاتی تھی — اُس زمانہ میں دس سو روپے بلا مبالغہ آجکل کے دس ہزار روپے کے برابر تھے)

یہ خاندان نہایت عزّت و وقار کے ساتھ حیدر آباد میں رہا۔ ان کی اپنی فٹاتی گاڑی تھی۔ ریس کا بھی شوق تھا۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ باوجود اس فارغ البالی و تنعم اور رسوخ و وقار کے آپ کا چال چلن مضبوط رہا۔ حضرت نوح ناروی نہایت وثوق کے ساتھ فرماتے ہیں کہ حیدر آباد کے قیام کے زمانہ میں صرف دو ایسے شخص تھے جو ریاستی تعیش کی فضا سے بالکل محفوظ رہے۔ ایک تو جناب سائل اور دوسرے احسن مارہروی۔

ایک مرتبہ خود سائل صاحب نے راقم الحروف سے فرمایا تھا کہ میں ایسے ایسے بلانوشوں کی صحبتوں میں رہا ہوں جو شراب سے حوض بھروا کر غوطہ لگاتے تھے مگر میں نے آج تک ایک قطرہ بھی نہ چکھا۔ بڑی صاحبزادی قدسیہ بیگم حیدرآباد

میں ۱۹۰۴ء میں پیدا ہوئیں۔ جب دہلی واپس ہوئے تو اس وقت صاحبزادی کی عمر چار برس تھی۔

حیدر آباد کے متفرق واقعات

مرزا خورشید عالم جو مرزا فخرو ولی عہد کے فرزند داغ صاحب کی والدہ کے بطن سے تھے۔ اُن میں اور سائل صاحب میں ایک مرتبہ لفظ "چھان بین" کے متعلق اختلاف ہوا۔ مرزا خورشید عالم کا دعویٰ تھا کہ "چھان بین" غلط ہے "چھان بنان" صحیح ہے اور سائل صاحب اس کے برخلاف دعویٰ رکھتے تھے۔ دونوں نے اس اختلاف کو استاد داغ کے سامنے پیش کیا۔ استاد نے فرمایا کہ دونوں صحیح ہیں مگر "چھان بنان" خاص قلعہ معلیٰ کا محاورہ ہے قلعہ کے باہر مقبول نہیں ہوا اور "چھان بین" شہر کا محاورہ ہے۔

جناب نوح ناروی حیدر آباد سے ۱۴ اکتوبر ۱۹۰۴ء کو اپنے وطن واپس آگئے تھے۔ ان کا اور سائل صاحب کا ساتھ تقریباً ۱۷ مہینے رہا۔ سائل صاحب کی بڑی صاحبزادی قدسیہ بیگم کو نوح صاحب نے گودیوں میں کھلایا ہے۔ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ یہ بچی میری گود سے گر پڑی تھی جس کا مجھے آج تک افسوس ہے۔

ایک مرتبہ اُستاد ظہیر اور اُستاد داغ میں کچھ شکر رنجی ہوگئی تھی اس کو دور کرنے اور دونوں اُستادوں کو گلے ملوا دینے کی خاص کوشش سائل صاحب نے کی تھی۔ قصّہ یہ تھا کہ مہاراجہ سر کشن پرشاد کے منصب یاب اُستاد ظہیر بھی تھے اور ایک فارسی شاعر معروف بہ ترکی بھی۔ ترکی صاحب نے اُستاد داغ سے کہا کہ اُستاد ظہیر کے حیدر آباد آنے کا منشا آپ کی جگہ حاصل کرنا ہے۔ داغ صاحب ظہیر صاحب کی طرف سے بدگمان ہوگئے۔ ظہیر کی آمدورفت داغ کے ہاں بہت زیادہ تھی اور

کافی میل جول تھا۔ اس ریشہ دوانی کے بعد ظہیر نے ان کے طرزِ عمل اور اندازِ گفتگو میں بہت بے رُخی اور روکھا پن محسوس کیا تو اپنی خودداری کا خیال کرتے ہوئے آنا جانا کم کر دیا مگر اصل معاملے کا علم نہ تھا۔

سائل، ظہیر کے ہاں بھی آمد و رفت رکھتے تھے۔ انھوں نے ایک روز دریافت کیا کہ آپ چچا جان کے ہاں پہلے تو اکثر تشریف لاتے تھے اب بہت کمی ہوگئی ہے کیا بات ہے؟

فرمایا کہ بھئی تمھارے چچا جان نے میرے ساتھ کچھ اپنا طرزِ عمل بدل دیا ہے اور کئی مرتبہ مجھ سے کچھ اُکھڑی اُکھڑی باتیں کیں۔ میں یہ تو نہیں سمجھ سکا کہ یہ تبدیلی کیوں ہے مگر آمد و رفت اس لئے کم کر دی ہے کہ میرا آنا ان کو زیادہ ناگوار نہ ہو۔

سائل نے ایک روز مناسب موقع دیکھ کر استاد سے دریافت کیا کہ چچا جان! پہلے تو ظہیر صاحب سے آپ کے بہت مراسم تھے مگر اب عرصہ سے یہ کچھ کم ہوگئے ہیں ظہیر صاحب بھی اب نہیں آتے کیا بات ہے؟

اُستاد نے فرمایا۔ ارے بھئی وہ تو میری جگہ لینے آئے ہیں۔ سائل نے کہا کہ آپ کو کیوں کر معلوم ہوا؟۔ فرمایا کہ ترکی کہہ گیا ہے۔ سائل نے تاڑ لیا کہ یہ محض ریشہ دوانی اور بہتان ہے۔ چنانچہ ظہیر سے یہ ماجرا بیان کیا۔ انھوں نے حلف اُٹھایا اور کہا کہ میرے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی یہ محض بہتان ہے اور پھر سائل اور ظہیر، داغ کے ہاں گئے وہاں بھی ظہیر نے حلف اُٹھایا۔ دونوں اُستاد گلے مل کر خوب روئے اور ایک طویل عرصہ کی کدورت دور ہوگئی۔ اس طرح سائل کی بدولت ترکی کی ترکی تمام ہوئی[1]

استاد ظہیر کے نواسے سید اشتیاق حسین صاحب المتخلص بہ شوق جو آج کل

---

[1] حسب روایت جناب نوح ناروی۔

ہمدرد دواخانہ میں کام کرتے ہیں یہ بھی اس زمانہ میں وہیں تھے۔ بارہ تیرہ برس کی عمر تھی شعر بھی کہتے تھے۔ داغ نے ظہیر سے کہا کہ اس لڑکے کو میرے سپرد کر دیجئے استاد ظہیر نے فرمایا کہ میں تو اس سے خود ہی کہتا ہوں کہ استاد داغ کے پاس جایا کرو۔ داغ صاحب نے کہا کہ آپ اس کو اصلاح نہ دیا کیجئے پھر یہ خود میرے پاس آیا کرے گا چنانچہ شوق صاحب استاد داغ کی خدمت میں حاضر ہوئے اس وقت سائل بھی موجود تھے۔ انھوں نے کہا کہ بغیر شیرینی کے میں ہرگز شاگرد نہ ہونے دوں گا۔ مگر شوق صاحب کے پاس رقم نہ تھی۔ سائل صاحب نے دو روپے دے کر شیرینی منگائی۔ اور اس طرح شاگردی کی رسم ادا ہوئی [1]

فصیح اللغات

اسی زمانہ میں جبکہ سائل صاحب حیدرآباد میں مقیم تھے "فصیح اللغات" مرتب ہو رہی تھی یہ عجیب و غریب ڈکشنری احسن صاحب مارہروی مرتب کر رہے تھے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ لغات کے معانی و مطالب احسن صاحب لکھتے تھے اور داغ کے سامنے پیش کرتے تھے اور وہ مختلف معانی و مطالب کے لئے بطور سند اپنا کوئی شعر لکھوا دیتے تھے یا فوراً کوئی شعر کہہ لیتے تھے۔ چنانچہ "یادگار داغ" جو داغ کا چوتھا دیوان احسن نے مرتب کیا ہے اس میں جو متفرق اشعار ہیں وہ تقریباً سب اسی مقصد کے پیشِ نظر کہے گئے ہیں۔

ایک مرتبہ سائل نے استاد کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ آپ اپنے چند معتمد شاگردوں کو چند ردیفیں تقسیم کر دیں تو اس طرح کام بہت جلد مکمل ہو جائے گا اور کتاب جلد ہی شائع ہو سکے گی۔ اس تجویز کو چونکہ احسن صاحب نے منظور نہ کیا اس لئے

---

[1] یہ واقعہ خود شوق صاحب نے بیان کیا۔

داغ صاحب بھی خاموش ہو گئے۔

افسوس کہ کتاب "فصیح اللغات" نامکمل رہی یعنی ردیف جیم تک لکھی گئی اور دنیائے ادب اس نعمتِ عظمیٰ سے محروم رہ گئی۔

اس کے کچھ عرصہ کے بعد ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ ایک روز سائل، احسن اور چند دیگر حضرات موجود تھے۔ استاد داغ نے اتفاقاً احسن کی طرف مخاطب ہو کر دریافت کیا کہ تمھارے ہاں نیچہ کیسا ہوتا ہے؟ احسن صاحب نے کہا کہ ہمارے ہاں قفلی جلیبی دار ہوتی ہے۔ سائل صاحب نے مزاحاً کہا کہ فصیح اللغات کے مؤلف ہو کر "جلیبی دار" کہتے ہو۔ اس پر احسن صاحب کبیدہ خاطر ہوئے اور فصیح اللغات کے متعلق سائل صاحب کی تجویز کا معاملہ چونکہ پہلے گذر چکا تھا اس لئے یہ بات احسن صاحب کو ہمیشہ کانٹے کی طرح کھٹکتی ہی رہی مگر آپس میں اتفاق و اتحاد قائم رہا اور جو لوگ اس واقعہ سے ناواقف تھے وہ محسوس نہ کر سکتے تھے کہ ان دونوں میں کچھ شکر رنجی بھی ہے۔[۵۱]

سائل صاحب کے قیامِ حیدر آباد کا زمانہ تقریباً ۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۸ء تک کا زمانہ ہے۔ اس عرصہ میں داغ صاحب کے چند مشہور شاگرد جو وہاں موجود تھے مندرجہ ذیل ہیں :-

سید افتخار عالم آزاد مارہروی، احسن مارہروی، بیدل شاہجہانپوری، نواب حسن علی خاں امیر، نواب عزیز یار جنگ عزیز، مرزا مظفر حسین بارق، ہمنجاب خاں خلق، حافظ محی الدین محفوظ، ڈاکٹر مہدی حسن آلم، شہزادہ منیر الدین ضیاء، امراؤ مرزا نادان، نواب عزیز جنگ ولا، جناب نوح ناروی وغیرہم۔

پہلے لکھا جا چکا ہے کہ سائل صاحب کے متعلق جو افواہ حیدر آباد میں اڑی تھی

---

۵۱ حسب روایت جناب نوح ناروی۔

کہ استاد داغ ان کے لئے غزل کہہ دیتے ہیں اس کی بنیاد غالبًا یہ تھی کہ مشاعروں میں داغ کی غزل بھی سائل ہی پڑھا کرتے تھے اور حضور نظام کی غزل پڑھنا بھی سائل کے سپرد تھا اور اپنی غزل تو خود پڑھتے ہی تھے اور خوب پڑھتے تھے۔ آپ کا انداز غزل خوانی آج تک مشہور ہے۔ بہر حال یہ افواہ حضور نظام تک بھی پہنچی۔ حضور نظام نے استاد داغ سے فرمایا کہ آپ اپنے بھتیجے کو لے کر آیئے۔ داغ ان کو لے کر دربار میں حاضر ہوئے۔ اعلیٰ حضرت نے اُن سے کچھ پڑھنے کی فرمائش کی۔ سائل نے عرض کیا کہ چچا جان نے مجھے آج ہی دربار میں حاضر ہونے کا حکم دیا ہے۔ دربار کے شایانِ شان میں کچھ نہ لکھ سکا۔ میری تمنا ہے کہ دربار میں کلام پیش کروں تو بندگانِ عالی کی مدح و ستائش سے ابتدا ہو۔ حکم ہوا کہ اچھا جاؤ ۴ بجے حاضر ہونا۔ اعلیحضرت نے سائل صاحب کو رخصت کر دیا اور استاد داغ کو اپنے پاس ہی رکھا۔ دو تین گھنٹے میں ایک طویل مدحیہ لکھ کر دربار میں حاضر ہوئے اور سرِ دربار سنایا۔ اعلیٰ حضرت بہت خوش ہوئے اور داغ صاحب سے فرمایا کہ میں نے آپ کو یہ اندازہ کرنے کی وجہ سے یہیں روک لیا تھا کہ آپ کا بھتیجا خود کہتا ہے یا آپ کہہ کر دیتے ہیں۔ مخالفین بہت خفیف ہوئے۔[1]

حیدر آباد میں سائل صاحب جن مشاعروں میں شرکت فرماتے تھے ان میں عام طور پر ایسی غزل پڑھتے تھے جو آٹھ نو اشعار سے متجاوز نہ ہوتی۔ ایک بار بر سبیلِ تذکرہ مہاراجہ سر کشن پرشاد نے کہیں یہ کہہ دیا کہ سائل صاحب کی غزل تو مختصر ہوتی ہے۔ یہ بات سائل صاحب تک پہنچی خاموش ہو گئے۔ چند روز بعد ہی مہاراجہ سر کشن پرشاد نے مشاعرہ کیا۔ انہیں بھی دعوت دی۔ طرح پر غزلیں شروع ہوئیں۔ ان کے سامنے شمع آئی

---

[1] یہ واقعہ مجھ سے محبِ محترم مولوی محمد حسن صاحب اختر تلمیذ حضرت سائل نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں کہ مجھ سے خود استاد مرحوم نے بیان فرمایا تھا۔

تو نہایت سادگی سے اپنی غزل پڑھی جو ۲۵ اشعار پر مشتمل تھی۔ مقطع کے ساتھ ہی اجازت چاہی کہ ایک طرحی غزل اور عرض کی ہے اگر اجازت ہو تو عرض کردوں۔ حاضرین نے بڑے اشتیاق سے ۲۵ اشعار کی غزل پھر سُنی اور مقطع کے ساتھ تیسری غزل کی اجازت چاہی۔ اس طرح ۲۵ - ۲۵ اشعار کی پانچ غزلیں پڑھیں۔ مہاراج بھی بہت لُطف اندوزی کے ساتھ سُن رہے تھے۔ جب مقطع پڑھا تو مہاراج ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے اور کہا کہ سائل صاحب میری طرف سے اگر آپ کو کوئی بات پہنچی ہے تو وہ محض برسبیل تذکرہ کہی گئی تھی اس سے میرا مقصود آپ کی توہین یا تنقیص نہ تھا۔ آپ کا کلام سُن کر آج بڑی مسرت اور خوشی ہوئی۔

سائل صاحب نے اپنے مخصوص منکسرانہ انداز میں عرض کیا کہ مہاراج آپ کا اتنا فرما دینا ہی کافی ہے میں تو مختصر غزل اس لئے پڑھتا تھا کہ میری کوتاہیاں اور عیوب جہاں تک ہو سکے کم ہی ظاہر ہوں تو اچھا ہے۔ لیکن جب ظاہر کرنا ہی ٹھہرا تو پھر میں نے خیال کیا کہ پورے طور پر اپنے عیوب کی نمائش کردوں۔

سائل صاحب کی یہ مسلسل غزلیں ان کی بیاض میں موجود ہیں۔[1]

کچھ خانگی زندگی کے حالات

استاد داغ نے ۱۹۰۵ء میں انتقال کیا۔ ان کی کوئی اولاد نہ تھی۔ نیز ان کی اہلیہ ان کی زندگی میں ہی انتقال کر چکی تھیں۔ ان کے انتقال کے بعد سائل دو ڈھائی سال تک حیدرآباد میں رہے۔

اس عرصہ میں ان کے ترکہ کے بارے میں بیگم سائل صاحب اور مرزا خورشید عالم کے مابین بڑی چپقلش رہی اس اختلاف اور مقدمہ بازی کا نتیجہ یہ ہوا کہ داغ

---

[1] بروایت مرزا جمیل الدین صاحب عالی ابن نواب سر امیر الدین مرحوم فخر الدولہ والیٔ لوہارو

کا ترکہ اور کلام وغیرہ بحق سرکار آصفیہ ضبط ہو گیا۔
۱۹۰۸ء میں سائل دہلی آگئے اور نگینہ محل فراشخانہ میں سکونت پذیر ہوئے۔
اس وقت بڑی صاحبزادی قدسیہ بیگم کی عمر تین، چار سال کی تھی، قدسیہ بیگم کی پیدائش حیدر آباد میں ۱۹۰۴ء میں ہوئی تھی۔ نگینہ محل فراشخانہ میں صاحبزادہ قطب الدین محمد میاں کی پیدائش ۱۹۱۰ء میں ہوئی۔
گذشتہ اوراق میں عرض کیا جا چکا ہے کہ نواب صاحب قبلہ کی پہلی شادی گوہر سلطان زمانی بیگم عرف ممو بیگم بنت نواب مختار حسین خاں آف پاٹودی کے ساتھ ہوئی تھی۔ یہ نواب قاسم علی خاں دیوان پاٹودی کی بھانجی اور سائل صاحب کی خالہ زاد بہن تھیں۔ نواب قاسم علی خاں کی ایک بہن سکندر جہاں تو سائل صاحب کی والدہ تھیں اور دوسری بہن اکبری بیگم نواب مختار حسین خاں والئ پاٹودی کو منسوب تھیں اور نواب قاسم علی خاں کی صاحبزادی سردار جہاں نواب ممتاز حسین خاں بن نواب مختار حسین خاں کو منسوب تھیں۔
ممو بیگم کا دوسرا نکاح سید منور علی خاں کے ساتھ ہوا۔ ان کا انتقال ۱۳۵۴ھ م ۱۹۳۵ء میں ہوا اور قدم شریف میں دفن کی گئیں۔
غرضکہ سائل صاحب کا دوسرا نکاح ۱۹۰۱ء میں موجودہ بیگم (لاڈلی بیگم) کے ساتھ ہوا جو چھوٹی بھاوج اور نواب ممتاز الدین احمد خاں مائل کی بیوہ تھیں۔ مائل مرحوم کے صاحبزادے مرزا ناصر الدین احمد خاں ہیں۔ حیدر آباد میں مرزا ناصر میاں کے ایک انگریز ماسٹر تھے جن کا نام تھا مسٹر کیری جو اُن کو پڑھانے آتے تھے۔ ناصر میاں کی پہلی شادی ان کی صاحبزادی سے چرچ میں عیسائی رسم و رواج کے مطابق ہوئی۔ ان کے بطن سے ان کے صاحبزادے مرزا فتح الدین ہیں جو آجکل غالباً کانپور میں ہیں۔
اس نکاح کے کچھ عرصہ کے بعد سائل صاحب تو دہلی چلے آئے تھے مگر ناصر میاں مع

اپنی زوجہ کے حیدر آباد ہی میں ایک کوٹھی لے کر رہے۔ سرکار نظام سے دونوں کا منصب تھا۔ مسٹر کیری کا انتقال ہو چکا تھا۔ کچھ عرصہ کے بعد آپس میں کچھ ناچاقی ہو گئی اور مرزا صاحب اپنی یوروپین بیوی کو حیدر آباد میں ہی چھوڑ کر دلّی آ گئے۔ یہاں آنے کے بعد دوسری شادی مرزا خورشید عالم کی نواسی (شبن بیگم) کے ساتھ ہوئی (یہ مرزا خورشید عالم بن مرزا فخرو ولی عہد داغ مرحوم کے ماں شریک بھائی تھے) حیدر آباد میں مسز ناصر میاں نے سرکار میں ایک درخواست دی کہ میرا شوہر مجھے چھوڑ کر تنہا دہلی چلا گیا ہے نہ مجھے خرچ بھیجتا ہے نہ آتا ہے نہ بلاتا ہے۔ لہٰذا اس کے منصب میں سے مجھے میرا حصہ یہیں ملنا چاہیے۔ اس درخواست کا یہ نتیجہ ہوا کہ دونوں کے منصب بند ہو گئے۔ تنگ آ کر مسز ناصر میاں دہلی آ گئیں۔ ناصر میاں اپنی پھوپھی کے ہاں محلہ مفتی والان میں رہتے تھے اور یوروپین خاتون سے ناراض تھے۔ آخر کار اس کو سائل صاحب نے اپنی حویلی میں جگہ دی۔ اور یہ یوروپین خاتون اپنی آخر عمر تک مع اپنے فرزند مرزا فتح الدین (عرف فتا میاں) کے سائل صاحب کے ہاں رہیں۔ سائل نے اپنی اولاد کی طرح ان کو رکھا اور انھوں نے بھی ان کو اپنا باپ سمجھا۔ انگریزی زبان میں (جو ان کی مادری زبان تھی) ادبی مہارت رکھتی تھیں۔ باوجود یوروپین ہونے کے پردہ کی اتنی سخت پابند رہیں کہ کسی نے آنچل تک نہ دیکھا۔ ۱۹۴۲ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ عیسائی مذہب پر آخر تک نہایت سختی سے قائم رہیں اور وصیت کے مطابق تجہیز و تکفین بھی عیسائی طریقہ پر ہوئی زندگی کے آخری چند سال ایسے گذرے کہ صاحبزادے سے بھی تعلقات کشیدہ ہو گئے تھے اور باپ بیٹوں نے ایسا چھوڑا کہ اس غمی میں بھی شریک نہ ہوئے۔

سائل صاحب کی اولاد

سائل صاحب کی پانچ اولادیں ہوئیں۔ رفیع[۱] الدین معظم مرزا، قدسیہ[۲] بیگم، قطب[۳] الدین محمد میاں، غلام نظام[۴] الدین محبوب میاں، غلام فرید[۵] الدین فرید میاں۔

معظم میاں جو خورد سال فوت ہوئے پہلی بیگم کے بطن سے تھے۔ نواب صاحب کی کنیت ابوالمعظم انھیں کی وجہ سے ہے۔

قدسیہ بیگم

موجودہ بیگم کی بڑی صاحبزادی ۱۹۰۴ء میں بمقام حیدرآباد پیدا ہوئیں۔ مرزا عبدالرب صاحب سابق سشن جج لاہور کی پہلی زوجہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ پھر یہ مرزا صاحب کو منسوب ہوئیں۔ ۱۹۴۲ء میں قدسیہ بیگم کا انتقال ہوگیا۔ استاد مرحوم کو صاحبزادی کے انتقال کا سخت صدمہ پہنچا اور اس صدمہ کی وجہ سے اُن کی صحت روز بروز گرتی ہی چلی گئی۔

نواب مرزا قطب الدین محمد میاں

اُن کو دیکھ کر اُستاد مرحوم کی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ جذباتِ محبت کی قدر و منزلت استاد زادے کے دل میں ہو یا نہ ہو مگر واصف محزوں کے دل میں جب تک اُستاد مرحوم کی محبت بھری نگاہوں کا تصور باقی رہے گا (اور یہ ہمیشہ رہے گا) اُستاد زادے کے لئے واصف کی آنکھیں فرشِ راہ رہیں گی۔

محترم اُستاد زادے مرزا قطب الدین محمد میاں المتخلص بہ فصیح کو سائل صاحب نے جناب بیخود دہلوی کا شاگرد کرا دیا تھا۔ فصیح تخلص بھی جناب بیخود دہلوی نے تجویز کیا تھا

بہت اچھے شاعر ہیں اور سخن فہم طبیعت رکھتے ہیں۔ حسن وخوبی اور وجاہت وشوکت میں اپنے والد مرحوم کا نمونہ ہیں اور بمصداق الولد سر لابیہ ان میں اپنے خاندانی محاسن واخلاق موجود ہیں۔ اگرچہ مخملی چوگوشیہ ٹوپی کی جگہ ہیٹ نے، آڑے چُست پاجامے اور تن زیب کے انگرکھے کی جگہ کوٹ پتلون نے حاصل کر لی ہے لیکن خصائل وعادات مشرقی تہذیب کے مطابق ہیں۔ ان کی سعادت مندی سے امید کی جاتی ہے کہ اپنے والد مرحوم کے صحیح جانشین ثابت ہوں گے اور اس قحط الرجال کے زمانے میں جبکہ مشرقی تہذیب و تمدن کی کشتی سخت طوفانوں میں گھری ہوئی ہے اپنی خاندانی اور وطنی روایات کی عظمت برقرار رکھنے میں کامیاب رہیں گے۔

ان کی پیدائش نگینہ محل فراشخانہ دہلی میں سنہ ۱۹۱۰ء میں ہوئی۔ اور مرزا عبدالکریم صاحب کی زوجۂ اولیٰ کی صاحبزادی سے شادی ہوئی۔

مرزا غلام نظام الدین محبوب میاں

۱۹۱۴ء میں بمقام لال دروازہ دہلی پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد انگریزی فوج میں ملازمت کر لی۔

۱۹۳۷ء میں نواب صاحب مرحوم ان کو حیدرآباد لے گئے اور وہاں کوشش کر کے ریاستی فوج میں تبادلہ کرا دیا۔ نیز حیدرآباد کی فوج میں ان کو میجر کا عہدہ مل گیا۔ جنگ یوروپ ۱۹۳۹ء کے زمانہ میں جب انگریزوں نے ایران پر فوج کشی کی تو حیدرآباد کی فوج بھی برطانوی افواج کے ساتھ بھیجی گئی اور اس کے ساتھ محبوب میاں بھی گئے۔

ایران کے ملک الشعراء بہار جو لکھنؤ یونیورسٹی کے پروفیسر رہ چکے تھے ان کی صاحبزادی طاہرہ بانو سے محبوب میاں کی نسبت ہوئی۔ جنگ کے زمانے میں

فوجیوں کی نقل و حرکت صیغۂ راز میں رکھی جاتی ہے۔ ہیڈ کوارٹر کی معرفت خط و کتابت ہوتی ہے۔ خطوط میں فوجی اپنا پتہ نہیں لکھ سکتا۔ یہاں نواب صاحب کو خط و کتابت کے ذریعہ سے اس نسبت کا علم ہوا اور ملک الشعراء نے بھی نواب صاحب کو نیازمندانہ خط اور تہنیت لکھ کر بھیجی۔ نواب صاحب نے اس کے جواب میں ایک فارسی کا قطعہ ملک الشعراء کی تعریف و تبریک کے طور پر لکھا۔

اس تقریب کے کچھ روز بعد مورخہ ۵ رفروری ۱۹۴۳ء کو حیدر آباد سے تار آیا کہ میجر غلام نظام الدین کا ہسپتال میں انتقال ہو گیا۔ تار میں انتقال کا سبب "گردن توڑ بخار" ظاہر کیا گیا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ مقام آبادان کے ہسپتال میں انتقال ہوا اور وہیں دفن کیے گئے۔

اسی سال ایک تعلیمی وفد ایران سے ہندوستان آیا تھا۔ اس کا مقصد یہ ظاہر کیا گیا تھا کہ ہندوستان کے تعلیمی اداروں کا مطالعہ کرے اور نئی تحقیقات کے مطابق اپنے ملک میں تعلیمی اصلاحات پیش کرے۔ اس وفد کے صدر آقائے رشید تھے جو طہران یونیورسٹی کے پروفیسر تھے اور طاہرہ بانو کے اُستاد بھی تھے۔

وہ طاہرہ بانو کا ایک ملفوف خط لائے جس میں اس نے اپنی تصویر بھی بھیجی تھی اور خط میں نواب صاحب کو "ابا جان" کے لفظ سے خطاب کر کے محبوب میاں کے انتقال پر اظہارِ ماتم کیا تھا۔ مگر انتقال کے اسباب اور تفصیلی واقعات کا قطعًا کوئی ذکر نہ تھا۔ مختلف قسم کی افواہیں اور خبریں آتی تھیں مگر اصل معاملہ کچھ ایسا پردۂ خفا میں تھا کہ کسی طرح کھلتا ہی نہ تھا۔

نواب صاحب قبلہ نے راقم الحروف واصف کو صدر وفد آقائے رشید کے پاس بھیجا کہ شاید ان سے کوئی صحیح واقعہ معلوم ہو جائے اتفاق سے اس روز وہ جامع مسجد دہلی کی زیارت کے لئے آئے تھے۔ میں نے جامع مسجد ہی میں ان سے گفتگو کی

اور واقعہ کی تفصیل چاہی مگر ان سے بھی کچھ تسلی بخش تفصیل نہ ملی۔

طاہرہ بانو

(جناب ڈاکٹر خواجہ عبدالرشید صاحب ایم۔بی بی۔ایس کا ایک خط بنام مدیر "برہان" دہلی)

رات گلزار صاحب تشریف لائے تھے تو پھر آپ کا ذکر خیر رہا اور "برہان" کے نئے پرچے بھی انھیں دکھلائے۔ستمبر کے پرچے میں ابوالمعظم نواب سراج الدین احمد خاں سائل پر جو چوتھی قسط تھی دونوں نے اسے اکٹھے دیکھا۔برہان کے لئے کچھ مواد پیدا ہوگیا جو ارسالِ خدمت ہے۔دیکھیے ماحول پیدا ہوتے ہی کچھ لکھنے میں دیر نہیں لگی۔ہم دونوں کے ساتھ ایک اور صاحب بھی تھے جن سے آپ آشنا ہیں۔یہ ہمارے کرمفرما سینیٹر عبدالرحیم شمشاد پشاوری ہیں جو حال ہی میں برما سے تشریف لائے ہیں اور سائل کے شاگردوں میں سے ہیں۔چنانچہ ان کی دلچسپی بھی قطعی تھی۔

اس خط سے مقصدِ اوّل تو ایک ایسی ادبی شخصیت سے تعارف کرانا ہے جس کا ذکرِ خیر نہایت ہی سرسری طور پر مندرجۂ بالا مضمون میں کیا گیا ہے اور دوسرے چند ایک غلط فہمیوں کا استدراک! یہ ہستی طاہرہ بانو ہیں۔میں ذاتی طور پر ان سے آشنا نہیں ہوں البتہ تعارفِ غائبانہ ضرور ہے۔اتفاق کی بات ہے کہ جب نظام میاں ایران میں تھے تو میں بھی اُدھر ہی کہیں صحرا نوردی کر رہا تھا۔گلزار صاحب سے تو آپ میرے تعلقات کو جانتے ہی ہیں۔نظام الدین مرحوم اور طاہرہ بانو سے انھیں بہت اُنس تھا چنانچہ خطوں میں قصّے ہوا کرتے تھے۔مگر میں طاہرہ بانو کی شخصیت سے بہت متاثر تھا۔چند مرتبہ انھیں ریڈیو تہران سے تقریر نشر کرتے سُنا۔وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ہندوستان بھر میں عورت کی زبانی ایسی تقریر اُردو زبان میں سُننے کا اتفاق نہیں

ہوا تھا۔ حیرت ہوئی کہ تہران سے یہ آواز کیسی! چنانچہ گلزار صاحب کے توسط سے مکمل تعارف ہوا۔ کچھ تو باتیں حافظہ میں تھیں اور کچھ رات اُن سے تصدیق کیں جو ذیل میں درج ہیں اور برائے اشاعت روانہ کر رہا ہوں۔

طاہرہ بانو، ملک الشعرا بہار کی بیٹی نہیں، بلکہ آپ کے والد بزرگوار کا اسمِ گرامی امیر علی معصومی ہے۔ آپ لکھنؤ یونیورسٹی میں پروفیسر تھے، نہ کہ ملک الشعرا بہار۔ جیساکہ مقالہ نویس نے لکھ دیا ہے معصومی صاحب آج کل حیدرآباد دکن میں تشریف فرما ہیں اور طاہرہ بانو بھی وہیں ہیں۔ طاہرہ بانو ملک الشعرا بہار کی شاگردِ رشید ہیں اور خود نہایت اچھی شاعرہ ہیں۔ کلام اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں موجود ہے۔ مگر اکثر غیر مطبوعہ۔ چند اشعار جو یاد رہ گئے ہیں وہ ذیل میں درج کر دوں گا۔

ملک الشعرا بہار نے غالباً کوئی قطعہ لکھا تھا جب ان کی نسبت پہلی بار نظام میاں سے ٹھہری۔ گلزار صاحب کا کہنا ہے کہ طاہرہ بانو اور اُن کے والدِ بزرگوار کے تعلقات ملک الشعرا بہار سے نہایت خوشگوار تھے اور غالباً خود گلزار صاحب کا تعارف ان سے ملک الشعرا بہار ہی کے مکان پر ہوا تھا تہران میں۔

آپ جانتے ہیں کہ مجھے اردو ادب سے چنداں لگاؤ تو ہے نہیں جو میں طاہرہ بانو کی شاعری پر پورے طور پر تنقید یا تبصرہ کر سکوں۔ ہاں اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ شاعری کے بلند معیار کا تخیل جو میرے ذہن میں موجود ہے اس پر ان کے اشعار ضرور پورے اُترتے ہیں۔ اگر میں اس وقت تشخیصِ الفاظ، سادگی، بیساختہ پن اور اشعار کے دیگر لوازمات پر بحث شروع کر دوں تو میں جانتا ہوں یہ محض تصنّع ہوگا۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ آپ کی شاعری کے کتنے دَور ہیں۔ البتّہ جو کچھ سُنا وہ پیش کیے دیتا ہوں۔ آپ خود بلندیٔ اشعار کا اندازہ کر لیں۔ وھو ہٰذا۔

ایک غزل کے کچھ اشعار ہیں:۔

پھر اُن کے در پہ جانے کا ارماں ہے آجکل
پھر عقل و عشق دست گریباں ہے آجکل

پھر الجھنیں پڑی ہیں سکونِ خیال میں
کیا زُلفِ یار رُخ پہ پریشاں ہے آجکل

کیا پوچھتے ہو کیسے گذرتی ہے زندگی
وحشت ہے اور ہم ہیں بیاباں ہے آجکل

اب طاہرہ خیال میں رنگینیاں کہاں
اُجڑا ہوا چمن دلِ ویراں ہے آجکل

میں نہیں کہہ سکتا کہ کن تاثرات کے تحت یہ غزل کہی گئی ۔ مگر پڑھنے والا کہہ سکتا ہے کہ کوئی حادثہ گراں ہوگا جس نے ایسے پاکیزہ جذبات کو ابھار دیا۔

مندرجہ ذیل چند اشعار آپ کی ایک فارسی غزل سے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے، اشعار خود بول رہے ہیں کہ کہنے والا اس میدان کا شاہسوار ہے۔ آپ کے مقالہ نویس نے تو یوں ہی طاہرہ بانو کا ضمنی طور پر ذکر کر کے چھوڑ دیا ورنہ ؏

تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

کہتی ہیں ؎

اے دوست! بسوئے کلبۂ ویراں خوش آمدید
در قلبِ چاک و دیدۂ گریاں خوش آمدید

در آشیانِ بلبلِ محزون و دل فگار
اے گل شگفتہ خاطر و خنداں خوش آمدید

از دردِ عشق و دوریٔ تو خوں گریستم
اے چارہ سازِ قلبِ پریشاں خوش آمدید

ایک اور اردو غزل کے چند ایک اشعار یاد رہ گئے ہیں وہ بھی سُن لیجئے۔ اس غزل کی تقریب بھی یاد نہیں، مگر دیکھ لیجیے اظہار کس قدر بے ساختہ اور نیچرل ہے۔ کسی نوجوان سے خطاب ہے جسے شاید قضا اُٹھا کرلے گئی ؎

اے جواں، اے نوجواں، ہاں سوچ لے پھر سوچ لے
زندگی بازی نہیں، شوخی نہیں، زنجیر ہے

تیری ہلکی مسکراہٹ اور میری بے بسی
مشرقی عورت ہوں بس میری یہی تقدیر ہے

اے ہمنوا! کیا ایک دن تو ہمسفر ہو جائیگا؟
ہم وطن ہونے کی کیا بس اک یہی تدبیر ہے

(خط کشیدہ الفاظ آخری مصرع کے یقینی نہیں غالباً ان کی جگہ پر کچھ اور ہوگا۔ گلزار صاحب سے تصدیق کی مگر ان کے حافظہ سے بھی اصل غزل از جمل ہو چکی تھی)

میرے خیال میں تدبیر کے بجائے لفظ تعبیر ہوگا۔ (واصف)

نظام میاں کی وفات کے بعد طاہرہ بانو کی شادی میجر سعید صاحب سے ہوئی جو آجکل حیدرآباد دکن میں لیفٹننٹ کرنل ہیں۔

لیجیے تعارف نویس نے کروا دیا اب آپ کا یہ فرض ہے کہ طاہرہ بانو سے کچھ لکھوا کر برہان میں شائع کر دیجیے۔ وہ صرف شاعر ہی نہیں بلکہ بہت سے موضوع انھیں از بر ہیں۔ ان کی نثر بھی ایک آدھ بار نظر سے گذری ہے۔ وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ بھی خوش گفتنی و درِ سفتنی ہے۔

(نوٹ از واصف) طاہرہ بانو سے خود حضرت سائل اور اُن کے فرزند قطب الدین بھی واقف نہ تھے۔ راقم الحروف نے جو کچھ لکھا وہ انھیں دونوں سے سُن کر لکھا معلوم نہیں کہ مدیر برہان نے طاہرہ بانو کا کلام حاصل کرنے کی کوشش کی یا نہیں اور اب اس کتاب کی اشاعت کے وقت مجھے معلوم نہیں کہ وہ کہاں ہیں؟

غلام فرید الدین

نواب صاحب مرحوم کے سب سے چھوٹے صاحبزادے غلام فرید الدین فرید میاں تھے جو ۱۹۱۸ء میں بمقام لال دروازہ پیدا ہوئے اور ایک سال سے کم عمر میں ۱۹۱۹ء میں جبکہ ہندوستان میں رولٹ ایکٹ ۱۱ مجریہ ۱۹۱۹ء کے خلاف ایجی ٹیشن ہو رہا تھا انتقال کیا۔ جس روز فرید میاں کا انتقال ہوا اس روز شہر میں بڑی زبردست ہڑتال تھی۔ تمام دواخانے بھی بند تھے۔ مریض کو دوا بھی نہ مل سکتی تھی۔ اس واقعہ کو نواب صاحب نے ایک نظم میں بھی ظاہر کیا ہے۔ یہ نظم ایک طویل ترجیع بند ہے جس

میں تحریک کی مخالفت کی گئی ہے۔

میں اس میں سے چند اشعار جو صاحبزادے کے سانحۂ ارتحال سے تعلق رکھتے ہیں نقل کرتا ہوں:۔

ہڑتال کے عروج کا قصہ بیاں ہو کیا	جس نے عطا کیا ہے غمِ جاوداں ہمیں
نورِ نگاہ لختِ جگر شیر خوار پور	کرنا پڑا زمین کے نیچے نہاں ہمیں
اِک بوند بھی دوا کی نہ جس کو ہوئی نصیب	ہڑتال کے یہ ذاتی ہوئے امتحاں ہمیں
مخلوق کی صعوبتیں جو گوش زد ہوئیں	بے حد و بے شمار ہوئیں لاتعد ہوئیں[۱۰]

یہ رولٹ ایکٹ مورخہ ۱۸ مارچ ۱۹۱۹ء کو مجلسِ مقننہ میں پاس ہوا تھا۔ اور اس کے بعد ہندوستان بھر میں گورنمنٹ برطانیہ کے خلاف زبردست بلوے ہوئے۔ سائل صاحب کے بچے فرید میاں کا انتقال اپریل ۱۹۱۹ء میں ہوا۔ اس وقت سائل صاحب جناب نوح ناروی کی صاحبزادی کی تقریب نکاح میں شرکت کی غرض سے نارے میں تشریف فرما تھے۔

نواب صاحب کی سکونت

نواب صاحب کا اصل آبائی مسکن گلی قاسم جان میں تھا جو نواب ضیاء الدین احمد خاں کا پھاٹک کہلاتا ہے۔ اب اس مکان میں جامعہ سطبیہ ہے۔ جب ۱۹۰۸ء میں حیدرآباد سے دہلی واپس آئے تو نگینہ محل فراشخانہ میں کرایہ کا مکان لے کر قیام کیا پھر ۱۹۱۰ء میں لال دروازہ کے اندر آخر میں جو محلسرا ہے یہ نواب صاحب کی والدہ کی طرف سے حصہ میں آئی تھی اس میں منتقل ہو گئے۔

لال دروازہ کی وجہ تسمیہ سوائے اس کے اور کچھ معلوم نہیں ہوتی کہ اس پر سرخی

---

[۱۰] واقعات دار الحکومت دہلی جلد اول صہ ۱۰۳۲

کا سُرخ رنگ ہے۔ یہ دروازہ شاہی زمانہ کا ہے اور اصل میں یہ مرزا مغل بیگ خاں کی حویلی کا دروازہ تھا۔[۱]

۱۹۳۴ء میں یہ مکان فروخت کیا گیا کیونکہ اس میں نواب صاحب کے بھتیجے مرزا ناصر الدین کا بھی حصّہ تھا فروخت کرکے تقسیم کیا گیا اور نواب صاحب نے اپنے رہنے کے لئے فراشخانہ میں حکیم عبدالرشید خاں کا مکان کرایہ پر لیا اور لال دروازے ہی میں پھاٹک سے ذرا آگے بڑھ کر دائیں ہاتھ کو ایک کٹڑہ نواب صاحب کی ملکیت تھا اس کو خالی کراکر مکان بنانا شروع کیا۔ یہ مکان ۱۹۳۶ء میں بن کر تیار ہو گیا اور نواب صاحب فراشخانہ سے اپنے نو تعمیر مکان میں منتقل ہو گئے اور اسی مکان میں انتقال ہوا۔ افسوس کہ ۱۹۴۷ء میں یہ مکان صاحبزادے نے حاجی نور احمد مالک ہمدم دواخانہ کے ہاتھ فروخت کرکے دہلی کو خیر باد کہا اور اپنی سسرال یعنی لاہور چلے گئے۔ اواخر ۱۹۴۷ء میں بیگم صاحبہ بھی دہلی سے رخصت ہو گئیں۔

نواب صاحب کی پبلک لائف اور حلقۂ احباب

نواب صاحب مرحوم چونکہ ایک والئ ریاست خاندان سے تعلق رکھتے تھے اس لئے مقامی حکام سے تعلق رکھنا ناگزیر تھا۔ چنانچہ ان کی خاندانی وفاداریوں اور اعزازات کی وجہ سے حکام بھی ان کی بہت قدر و منزلت کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ان کی ذاتی قابلیت اور علم و فضل اور مجد و شرف بھی ہر شخص کو ان کی عزت و احترام پر مجبور کرتا تھا۔

دہلی کے زعماء و مشاہیر جن سے نواب صاحب کے دوستانہ مراسم تھے جہاں تک مجھے معلوم ہے مندرجہ ذیل تھے۔ پیر جی مظفر علی مرحوم سجادہ نشین خواجہ باقی باللہؒ (یہ کسی رشتے سے نواب صاحب کے خالہ زاد بھائی تھے) ڈپٹی عبدالحامد خاں مرحوم،

---

[۱] واقعاتِ دارالحکومت دہلی صفحہ ۱۹۷ جلد دوم

خان بہادر حکیم امجد علی خاں مرحوم آنریری مجسٹریٹ، ڈپٹی سید ہادی حسین مرحوم نواب فیض احمد خاں مرحوم، حکیم اجمل خاں مرحوم، قاری سرفراز حسین عزمی مرحوم، حافظ عبدالرحمٰن مدح خواں مرحوم۔

ہندوستان کے دیگر مشاہیر میں سے مندرجۂ ذیل حضرات سے بھی سائل صاحب مرحوم کے خاص مراسم تھے۔ رائے صاحب بجرنگ بہادر سنگھ ریاست بھدری ضلع پرتاپ گڑھ، رائٹ آنریبل سر تیج بہادر سپرو الٰہ آباد، پنڈت دیوان رادھے ناتھ کول گلشن، سر شاہ محمد سلیمان مرحوم چیف جسٹس فیڈرل کورٹ، جناب صفی لکھنوی، جناب بیباک شاہجہانپوری، نواب عزیز یار جنگ عزیز حیدرآباد، پنڈت تربھون ناتھ زار دہلوی، جناب نوح ناروی۔

حکیم اجمل خاں

حکیم اجمل خاں خاندانِ شریفی کے آفتاب تھے جن پر اس خاندان کی قدیمی روایات اور تہذیب و معاشرت کا خاتمہ ہوگیا۔ حکیم صاحب کی ذاتِ گرامی مکارمِ اخلاق اور علم و فضل، مجد و شرافت کا مجموعہ تھی۔ ان کے دولت خانہ پر بالعموم رات کو بعد عشاء مجلسِ احباب ہوتی تھی۔ اکثر بڑی دلچسپ علمی و ادبی صحبتیں رہتی تھیں اور شہر کے علماء و ادباء جمع ہو جاتے تھے۔ حکیم صاحب متبحر عالم تھے۔ عربی و فارسی ادب پر بھی پورا عبور تھا۔ متانت کا یہ عالم تھا کہ کبھی قہقہہ لگاتے نہیں دیکھا گیا۔ باوجود اس کے بذلہ سنج بھی تھے اور نہایت لطیف مذاق کرتے تھے۔ طبیعت میں سلامت روی تھی۔ نواب سر امیر الدین احمد خاں مرحوم والی ریاست لوہارو جو حضرت سائل کے حقیقی بہنوئی تھے ان کے خاص دوستوں میں سے تھے۔ حکیم صاحب اُن کو بھائی صاحب کہا کرتے تھے۔ نیز مولانا ابوالکلام آزاد اور علامہ مفتی کفایت اللہ وغیرہم سے بھی

عقیدتمندانہ خلوص رکھتے تھے۔

نواب شجاع الدین احمد خاں تاباںؔ اور نواب سراج الدین احمد خاں سائلؔ دونوں بھائی حکیم صاحب کی مجلسوں میں ان کے دولت خانے پر بھی شریک ہوا کرتے تھے اور اکثر سفروں میں ساتھ رہتے تھے۔ ایک مرتبہ حیدرآباد کے سفر میں بھی ساتھ تھے اور وہاں بھی دلچسپ ادبی مشغلہ رہتا تھا۔

حیدرآباد سے واپسی کے بعد حکیم صاحب ۱۹۱۳ء میں سخت بیمار ہوئے تذریے افاقہ ہوجانے کے بعد تبدیل آب وہوا کی غرض سے اوکھلہ میں قیام تجویز ہوا۔ دورانِ قیام میں نواب شجاع الدین احمد خاں تاباںؔ اور نواب سراج الدین احمد خاں سائلؔ اور میر باقر علی داستان گو اور حافظ احمد خاں استاد شطرنج وغیرہ احباب و مصاحبین کا زیادہ وقت اوکھلہ ہی میں گزرتا تھا۔ یہ کبھی علیحدہ علیحدہ آتے تھے اور کبھی سب جمع ہوجاتے تھے۔ اجتماعی صحبت بہت پر لطف ہوتی تھی۔ سائل صاحب جیسے قادر الکلام اور مشہور زمانہ شخص کا یہ حال تھا کہ اس صحبت میں پہنچ کر دنیا ومافیہا کو بھول جاتے تھے۔ تاباںؔ صاحب و سائلؔ صاحب دونوں بھائی طویل القامت بھاری بھرکم اور نہایت خوبصورت بزرگ تھے۔ سائلؔ صاحب اپنے بھائی کا بیحد احترام کرتے تھے اور اپنے باپ کی جگہ سمجھتے تھے۔

شفاء الملک حکیم رشید احمد خاں نے اپنی تالیف حیاتِ اجمل میں حکیم صاحب کی مجلس کا ایک واقعہ لکھا ہے کہ سائلؔ صاحب کو ایک طبی سوال پہلے سے سمجھا دیا گیا تھا تاکہ وہ تاباںؔ صاحب کی موجودگی میں وہ سوال مجلس میں پیش کریں۔ غرضیکہ نواب سائلؔ نے دوسرے وقت تاباںؔ صاحب کی موجودگی میں حکیم صاحب کی طرف متوجہ ہوکر باادب عرض کیا کہ بھائی صاحب میں کئی روز سے ایک طبی مسئلہ میں سخت متردد ہوں جس کو اگر آپ نے صحیح تسلیم کرلیا تو نہ صرف

میری زندگی کا ایک اصول بدل جائے گا بلکہ دنیا پر ایک جدید حقیقت کا انکشاف ہوگا۔

آپ کو معلوم ہے کہ میں اپنے زمانۂ ہوش سے آج تک اپنے بھائی کو باپ کی جگہ سمجھتا ہوں اور بے حد احترام کرتا ہوں۔ مگر آج کے بعد بھائی صاحب کو اسی طرح میرا احترام کرنا ہوگا۔ نہ مسئلہ یہ ہے کہ توام بچوں میں سے جو بعد میں پیدا ہوا وہ بڑا ہے کیونکہ استقرار تو اسی کا پہلے ہوا تھا۔ دوسرا اپنے موخر استقرار کی وجہ سے اس کی پیدائش میں حائل ہوا۔ حضرت تاباںؔ سے اس کا جواب نہ بن پڑا، برس پڑے، گالیاں دینے لگے۔ حاضرینِ مجلس اور حکیم صاحب مونھ پھیر پھیر کر ہنستے تھے اور پھر سائل صاحب کے چست فقرے مزید ستم ڈھا رہے تھے کہ بھائی صاحب! اب تو آپ کو گالیاں دینے کا حق نہیں۔ اب تو آپ کو میرا احترام کرنا چاہیئے۔ کافی دیر تک دلچسپ گرما گرمی رہی۔ آخر میں حکیم صاحب نے استاد تاباںؔ کے حق میں فیصلہ دیا اور سائلؔ صاحب کو شکست ہوئی[۱]۔

حکیم اجمل خاں کا انتقال ۲۸ دسمبر ۱۹۲۷ء م ۱۳۴۶ھ میں بمقام رام پور ہوا اور جنازہ دہلی لاکر درگاہ سید حسن رسول نما میں دفن کیا گیا۔

مؤلف حیاتِ اجمل نے لکھا ہے کہ تاباںؔ اور سائلؔ دونوں توام بھائی تھے اور اسی بنا پر متذکرہ واقعہ کی بنیاد ہے۔ حالانکہ تاباںؔ کی تاریخ پیدائش ۱۲۷۸ھ ہے اور ان کے بعد ان کے بھائی مرزا بہاءالدین طالب کی پیدائش ۱۲۷۹ھ کی ہے اور ان دونوں سے چھوٹے سائلؔ صاحب ہیں جن کی تاریخ پیدائش ۱۲۸۰ھ کی ہے۔ ان میں سے جوڑواں کوئی بھی نہیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ حکیم صاحب کی محفل میں کچھ اس قسم کا مذاق ہوا ہوگا جس کو مؤلف حیاتِ اجمل نے واقعۂ نفس الامر

---

[۱] حیاتِ اجمل مؤلفہ شفاء الملک حکیم رشید احمد خاں۔

خیال کیا۔

نیز مؤلف حیات اجمل لکھتے ہیں کہ حکیم صاحب نے تاباںؔ صاحب سے کچھ اردو کلام میں اور زیادہ تر فارسی کلام میں اصلاح لی ہے۔ یہ بھی صحیح نہیں ہے۔ یہ غالباً اس بنا پر غلط فہمی ہوئی کہ حکیم صاحب ان کو اُستاد کہتے تھے۔ حکیم صاحب ہی نہیں، بلکہ اُن کو تمام ہم عصر لفظ "اُستاد" سے خطاب کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ تاباںؔ صاحب نہایت معزّز اور قابلِ فخر خاندان کے فرد تھے اور ایک ایسے اولوالعزم دادا کے پوتے تھے جس کا علم و فضل تمام ہندوستان میں مسلّم تھا۔ اور خود بھی علومِ مشرقیہ میں درک رکھتے تھے۔ ان تمام امور کے علاوہ نہایت مغلوب الغضب تھے جو شخص ان کو اُستاد نہ مانے اس سے ناراض ہوتے تھے اور جو اُن کا کلام نہ سُنے اس کو بُرا بھلا کہتے تھے اور جو ان کے کلام کی داد نہ دے اس کو جاہل کہتے تھے۔ لوگ ان کی عادات سے واقف تھے اور خاندانی وقار کا بھی پاس تھا اس لئے اکثر لوگ ان کو اُستاد کہتے تھے۔

جناب سیّد اشتیاق حسین صاحب شوقؔ بنسبیہ استاد ظہیرؔ دہلوی حکیم اجمل خاں مرحوم کے مطب میں برسوں رہے اور سائلؔ صاحب کے دولت خانہ پر ہی قیام رہتا ہے وہ فرماتے ہیں کہ حکیم صاحب کی مہارت اور قابلیت تمام اصنافِ فنون میں تاباںؔ صاحب سے بدرجہا زائد تھی۔ تاباںؔ صاحب سے ان کا اصلاح لینا صحیح نہیں ہے۔

یادِ اجمل

از حفیظ الرحمان واصفؔ دہلوی یکے از تلامذۂ حضرت سائلؔ دہلوی

زمینِ ہند پر برپا قیامت خیز طوفاں ہے — لبوں پر نالۂ و شیون دلوں میں سوزِ ہجراں ہے

اسیرِ درد کی قسمت پہ ناکامی بھی خنداں ہے
یہ صورت دیکھ کر دیدہ سیہ بختوں کا گریاں ہے

صدائے درد و غم بگرفتہ مشرق را و مغرب را
کہ ماوائے نمانندہ مجد و فضل و حکمت طب را

مسیح الملک جو سدرہ نشین عزم و ہمت تھا
سحابِ فیض کوہِ استقامت بحرِ حکمت تھا
وہ اجمل جو فروغ افزائے بزمِ دین ملت تھا
مسلّم رہبرِ اعظم مسلمانوں کی قسمت تھا

نگاہیں ڈھونڈھتی ہیں اس نوا سنجِ صداقت کو
ترستا ہے دلِ بیتاب اب عیش و مسرت کو

وہ اجمل آہ جو زینت دہ ایوانِ امکاں تھا
شرافت کے سخا کے آسماں کا مہرِ تاباں تھا
وہ جس کے فیض سے دہلی کا خطہ اک خیاباں تھا
جُدا ہم سے ہوا فردوسِ دہلی کا جو رضواں تھا

پیاپے آرہی ہے یہ صدا شہرِ خموشاں سے
جو قابلِ ناز کے تھی لٹ گئی رونق گلستاں سے

وہ اجمل آہ جو کل تک رئیسِ بزمِ خلّاں تھا
چراغِ زندگانی آہ کل جس کا فروزاں تھا
ہوا وہ آج رخصت جس پہ سارا ہند نازاں تھا
ہمارا ہم نوا، غمخوار، دردِ دل کا درماں تھا

نقابِ خاک میں پنہاں فلک نے کر دیا اس کو
وطن سے دور جا کر موت کا ساغر دیا اس کو

جو کل تک جلوہ آرا تھا سریرِ علم و عرفاں پر
کرم کی ضو فشانی کر رہا تھا چرخِ احساں پر
برابر کار فرما تھا ہمارے جسم اور جاں پر
ترنّم ریزیاں جو کر رہا تھا بزمِ امکاں پر

فلک کے جورِ بے جا نے کیا نذرِ فنا اس کو
چھپایا زیرِ خاک اس کو کیا ہم سے جدا اس کو

صدائیں گونجتی ہیں پی کہاں کی کوہساروں میں
ترانے درد کے گاتی ہے بلبل مرغزاروں میں
چلی جاتی ہے زاری اشکباری آبشاروں میں
سراپا حزن ہے اُف زیر و بم بربط کے تاروں میں

نظر جس پر اٹھائی اس کو غم میں مبتلا پایا
زباں پر نام جب آیا تو غم ہی کا مزا پایا

کہاں ہو آہ اے اجمل نگاہیں تم کو جویا ہیں — تمہاری یاد میں مضطر تمہارے نام لیوا ہیں
در و دیوار سے آثارِ ویرانی ہویدا ہیں — تسلّی دو ہمیں آکر کہ ہم ماتم سراپا ہیں

سراسر خوں شدہ ارماں زچشمِ خوں فشاں ریزد
بیادت خوش بگریم خوں زہر اشکم فغاں ریزد

دعا ہے اب کہ جولانگاہِ اجمل خلدِ اعلیٰ ہو — دعا ہے اب کہ اجمل نغمہ سنجِ شاخِ طوبیٰ ہو
بروزِ حشر زیرِ سایۂ عرشِ معلّیٰ ہو — شہنشاہِ عرب کا قرب شاملِ لطفِ مولیٰ ہو

گہر ہائے سرشکم می فشانم بر مزارِ تو
بہ اراے دو عالم می سپارم جملہ کارِ تو

عام اخلاق و عادات

نواب صاحب مرحوم کی ذاتِ گرامی اسلامی تہذیب و اخلاق کی حامل تھی۔ چھوٹوں کے ساتھ محبت و شفقت، ہم عصروں کے ساتھ اخوت و مودت، علماء و صلحا کے ساتھ اخلاص و عقیدت ان کی خصوصیات تھیں۔

ہندوستان کے مشہور دار العلوم مدرسہ امینیہ دہلی کے جلسوں اور تقریبات میں نواب مرحوم ضرور شریک ہوا کرتے تھے اور اکثر نظمیں بھی پڑھا کرتے تھے۔ مدرسہ امینیہ کی بنا حضرت مولانا امین الدین صاحب (المتوفی ۱۳۳۸ھ) نے ۱۳۱۵ھ میں رکھی تھی، ان کے ساتھ نواب صاحب کو انتہائی محبت و عقیدت تھی۔ مولانا مرحوم کے انتقال کے بعد مدرسہ امینیہ کا اہتمام راقم الحروف کے والد ماجد حضرت علامہ مفتی محمد کفایت اللہ صاحب مدظلہم العالی کے سپرد ہوا۔ حضرت مفتی صاحب قبلہ کے ساتھ نواب

صاحب مرحوم کو جو عقیدت تھی اس کا اندازہ ذیل کے واقعات سے بخوبی کیا جاسکتا ہے۔

حضرت مفتی صاحب کو باوجود آنکھیں جاتے رہنے کے پہچان لیتے تھے۔ ایک مرتبہ میں نے دریافت کیا کہ حضرت! مفتی صاحب کو آپ کس طرح پہچان لیتے ہیں۔ فرمایا کہ یہ بات بتانے کی نہیں ہے۔ میں نے اصرار کیا۔ فرمایا کہ میں مفتی صاحب کا عاشق ہوں، ظاہری آنکھوں سے نہیں دل کی آنکھوں سے پہچانتا ہوں میری رُوح ان کے سامنے جُھک جاتی ہے۔

کتب خانہ رحیمیہ کے سامنے رکھشا کھڑی ہے۔ نواب صاحب رکشا میں تشریف رکھتے ہیں اور سگریٹ سے شوق فرما رہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ حضرت مفتی صاحب تشریف لا رہے ہیں۔ سگریٹ فوراً رکشا کے پیچھے پھینک دیتے ہیں۔ معمول کے مطابق مزاج پُرسی وغیرہ کے بعد مفتی صاحب تشریف لے جاتے ہیں۔ جو شخص موجود ہوتا ہے اس سے نواب صاحب دریافت فرماتے ہیں کہ مفتی صاحب نے دیکھا تو نہیں؟

راقم الحروف سے بے انتہا محبت فرماتے تھے اور اکثر شام کو کتب خانہ رحیمیہ پر تشریف لاتے تھے۔ اور ۱۹۳۸ء سے جب سے کولھے اور ٹانگیں بالکل بے کار ہوگئی تھیں اُٹھنے بیٹھنے سے معذور ہوگئے تھے۔ روزانہ شام کو رکھشا میں تشریف لاتے تھے۔ یہ وضعداری اس پابندی کے ساتھ آخر وقت تک جاری رہی کہ آندھی اور مینہ کے باوجود ناغہ نہ کرتے تھے۔ رکھشا کے ساتھ ایک کرسی رہتی تھی جس میں دونوں طرف دستے لگے ہوئے تھے۔ رکھشا سے کرسی پر کھسک آتے تھے۔ کرسی کو دو آدمی اُٹھا کر دُکان کے تختہ کے قریب لگا دیتے تھے۔ اسی طرح کِھسک کر تختہ پر بیٹھ جاتے تھے اور اکثر رکھشا ہی میں بیٹھے رہتے تھے۔ بعض ملاقاتی اور شاگرد وغیرہ بھی آجاتے تھے۔ کبھی ادبی مشغلہ کبھی اصلاح و تنقید اور کبھی مختلف موضوعوں پر

گفتگو رہتی تھی۔

راقم الحروف کو اپنا مرشد زادہ فرمایا کرتے تھے۔ فرماتے تھے کہ میری زندگی کے یہی دو گھنٹے ہیں جن میں میں اپنے آپ کو زندہ تصوّر کرتا ہوں۔ میں عرض کرتا کہ یہی دو گھنٹے میری بھی سعادت و خوش نصیبی کے ہیں۔ ایک روز جبکہ کتب خانہ کے سامنے رکھشا میں تشریف رکھتے تھے حضرت مفتی صاحب تشریف لائے۔ مزاج پرسی کی۔ نواب صاحب آبدیدہ ہو گئے اور فرمایا کہ حضرت مفتی صاحب! جی رہا ہوں اور راقم الحروف کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ اگر یہ نہ ہوتا تو میں کبھی کا مر چکا ہوتا۔ اس بچّے کے پاس دو گھڑی کے لئے آجاتا ہوں اور اسی وقت میں اپنے آپ کو زندہ سمجھتا ہوں۔

اس مدت میں ان کو میں نے بہت قریب سے دیکھا ہے۔ کبھی کسی کی غیبت کرتے نہیں دیکھا۔ فحش اور گالی کا تو وہم بھی نہ تھا۔ حالانکہ بعض اُدبا گالی کو بھی ایک ادبی خدمت سمجھتے ہیں۔ بعض لوگوں نے ان کے مونھ پر گالیاں دیں مگر انھوں نے کبھی جواب نہ دیا۔

مرحوم کے بھتیجوں میں سے ایک ہونہار شاعر مرزا جمیل الدین عالی (بن نواب سر امیر الدین احمد خاں) بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے مرحوم کے سامنے کہا کہ فلاں شخص آپ کی شان میں گستاخی کرتا ہے۔ فرمایا کہ بٹیا! جب تم میری گود میں بیٹھ کر میری ڈاڑھی نوچتے تھے اور میں کبھی تم پر ناراض نہیں ہوا تو میں ان لوگوں کو کیا کہوں جو میری عیب چینی کرتے ہیں۔

نہایت وسیع الظرف، فراخ دل اور سیر چشم تھے۔ اندازِ گفتگو شیریں اور دلچسپ ہوتا تھا۔ اسلامی تہذیب اور وضعداری کے دلدادہ تھے اور ایسے رئیس سے مل کر بہت خوش ہوتے تھے جو باوجود دولت مندی کے اسلامی شعائر کا پابند ہو۔

غالباً ۱۹۳۱ء کا واقعہ ہے کہ سی پی کے ایک نوجوان والیٔ ریاست نواب

عبدالوحید خاں غازی آف گوردھانہ ہلی آئے تھے۔ میں نے اُن کو اور اُستاد مرحوم کو اپنے غریب خانہ پر دعوت دی تھی۔ بڑی دلچسپ محفل رہی۔ اُستاد مرحوم فرماتے تھے کہ میں نے نوجوان رئیسوں میں اس شخص جیسا متدین اور متشرع رئیس نہیں دیکھا۔ فرمایا کرتے تھے کہ ایسے لوگوں سے بھی میرا رابطہ رہا ہے جنھوں نے شراب کے حوض میں غوطے لگائے ہیں مگر میں نے ایک قطرہ شراب نہیں پی۔ حضرت نوح ناروی فرماتے ہیں کہ قیام حیدرآباد کے زمانہ میں صرف دو شخص ایسے تھے جن کا کیرکٹر ریاستی تعیش کی فضا سے یکسر محفوظ رہا۔ ایک سائل دہلوی دوسرے احسن مارہروی۔

نواب صاحب کا تحمل اور ضبط ضرب المثل ہے۔ اپنے بھائی تاباں کی گالیاں کھاتے تھے اور ہمیشہ باپ کی جگہ سمجھتے تھے اور بے حد احترام کرتے تھے۔ مرزا جمیل الدین عالی بیان کرتے ہیں کہ ایک نوجوان شاعر نے نواب صاحب سے ملاقات کی۔ نواب صاحب نے فرمایا کہ بیٹا کچھ سُناؤ۔ صاحبزادے فرمانے لگے کہ میں اس وقت موڈ میں نہیں ہوں۔ فرمایا کہ بیٹا میرا مکان لال دروازے میں ہے اور مجھے سائل کہتے ہیں جب موڈ میں ہو تو میرے غریب خانے پر آکر کچھ سُنا دینا۔

بیباک شاہجہانپوری جو حضرت داغ کے ارشد تلامذہ تھے اور شاہجہاں پور کے محترم بزرگ اور سجادہ نشین تھے۔ یہ سائل صاحب سے پہلے گروہ میں تھے۔ ان کے ایک شاگرد محبی شمس الدین شمس شاہجہانپوری نے راقم الحروف سے بیان کیا کہ جناب بیباک مرحوم سائل صاحب سے اپنی پہلی ملاقات کا اس طرح ذکر کرتے تھے کہ میں دارالعلوم دیوبند جاتے ہوئے سائل صاحب کی ملاقات کی نیت سے دہلی اُتر آئے میں قیام کیا۔ اس کے بعد نواب صاحب کے مکان پر گیا۔ میری سج دھج بالکل طالبعلمانہ تھی اور نواب صاحب نہایت وجیہ و شکیل ہونے کے ساتھ رئیسانہ ٹھاٹھ رکھتے تھے میں ان کے سامنے جاکر خاموش بیٹھ گیا۔ نواب صاحب نے دیگر حاضرین و احباب سے فارغ

ہو کر مجھ سے دریافت کیا کہ آپ کیا فرماتے ہیں۔ میں نے کہا کہ میں نے آپ کا شہرہ سُنا تھا۔ مگر کبھی زیارت کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ دیو بند جارہا ہوں آپ کی زیارت کی غرض سے دہلی اُترا ہوں اور آپ کا کلام سُننے کا بیحد اشتیاق ہے۔ نواب صاحب نے گھر میں سے بیاض منگائی اور ایک غزل سُنائی۔ بیباک صاحب ساری غزل سُن گئے اور قصداً داد نہ دی بالکل خاموش رہے۔ اس کے بعد نواب صاحب نے فرمایا کہ اب آپ اپنا کلام سُنائیے۔ بیباک صاحب نے کہا کہ میں تو ایک طالب علم ہوں شعر کہنا کیا جانوں۔ نواب صاحب نے ملازم سے کہا کہ پھاٹک بند کردو۔ یہ اب شعر سنائے بغیر یہاں سے نہیں جاسکتے۔ اللہ رے جوہر شناسی! نواب صاحب فرماتے ہیں کہ یہ ناممکن ہے کہ تم شاعر نہ ہو۔ تم کو اپنا کلام سُنانا پڑے گا۔ بیباک صاحب نے کہا کہ تعمیلِ حکم کے لئے کچھ عرض کرتا ہوں۔ میں پانچ رنگ میں کہتا ہوں۔ غالب، میر وغیرہ، جس رنگ کا کلام آپ سننا چاہیں عرض کردوں۔ نواب صاحب نے غالب کے رنگ کی فرمائش کی۔ انھوں نے غزل پڑھی مقطع نہیں پڑھا۔ اسی طرح نواب صاحب نے پانچ رنگ کی پانچ غزلیں سنیں اور داد دیتے رہے بیباک صاحب نے پانچویں غزل میں جب مقطع پڑھا تو نواب صاحب کھڑے ہو کر لپٹ گئے اور فرمایا کہ میرے بھائی ہو کر تم نے مجھ پر یہ ظلم کیا۔ بتاؤ کہاں ٹھہرے ہو اور ساتھ ہی ملازم کو حکم دیا کہ گاڑی لاؤ۔ گاڑی تیار ہوئی۔ خود ساتھ جاکر سرائے سے سامان اُٹھوا کر لائے اور بڑی گرم جوشی سے میزبانی کی۔

سندیلہ ضلع ہردوئی میں سید التفات رسول صاحب[1] ہاشمی کے اہتمام سے نہایت پُرشکوہ سالانہ مشاعرہ ہوا کرتا تھا۔ اس میں تمام ہندوستان کے شعرا شریک ہوتے تھے لکھنؤ کا قرب ہونے کی وجہ سے بالخصوص شعرائے لکھنؤ بہت زیادہ شریک ہوتے تھے۔ سائل مرحوم بھی کئی مرتبہ تشریف لے گئے اور ہر مرتبہ صدارت کی کرسی پر جلوہ افروز ہوئے۔

---

[1] بیگم اعزاز رسول جو مجلس مقننہ کی ممبر ہیں یہ سید التفات رسول مرحوم کی بہو ہیں۔

سندیلہ کی شرکتِ مشاعرہ کے بارے میں خمخانۂ جاوید کے مؤلف نے اس طرح اظہارِ خیال کیا ہے کہ :-

"سندیلہ کی بزمِ سخن یعنی مشاعرۂ جناب ہاشمی اس بات پر شاہد ہے کہ اُدھر تمام شعرائے لکھنؤ کی ٹولی اِدھر صرف ایک مردِ میدانِ سخن جناب سائل تھے۔ لیکن پالا آپ ہی کے ہاتھ رہا اور جماعت بندی کے ہوتے ہوئے بھی آپ ہی کی غزل پر بے اختیار ہو کر ہر مخالف اور موافق نے داد دی۔"

بیباک مرحوم اپنی خصوصیات کے لحاظ سے اسم با مسمّٰی تھے۔ نہایت مغلوب الغضب اور بیباک تھے۔ ایک مرتبہ سندیلہ کے مشاعرے میں انھوں نے سائل صاحب کو کچھ ایسے الفاظ کہہ دیئے جو برادرانہ نقطۂ نظر سے نامناسب تھے۔ مگر سائل صاحب نے ان کی بزرگی اور تقدمِ تلمّذ کی وجہ سے سر جھکا لیا اور خاموشی کے ساتھ پی گئے۔ حالانکہ سائل صاحب کی وجاہت اور شان و شوکت کا یہ عالم تھا کہ جب جناب نوحؔ ناروی کی صاحبزادی کی شادی ۱۹۱۹ء میں ہوئی[۱] اور یہ بھی اس تقریب میں شریک ہونے کے لئے نارہ ضلع

۱؎ بروایت جناب نوحؔ ناروی اس تقریب کی شرکت سے قبل حضرت سائل مرحوم نے پٹنہ سے جناب نوحؔ ناروی کو جو خط لکھا تھا وہ مؤخر الذکر نے اپنی خاص عنایت سے مجھے مرحمت فرمایا ہے۔ اس کی نقل درج ذیل کرتا ہوں :-

درگاہ ارزاں شاہ ۱۲ر اپریل ۱۹۱۹ء

نوحؔ بھائی ! تسلیم میں اسی وقت مع الخیر پٹنہ پہنچا ہوں۔ بھائی احسن صاحب کو یہاں موجود پایا۔ الحمد للہ کہ صعوبتِ سفر کا اثر کچھ طبیعت پر ہنوز گراں نہیں پاتا حالانکہ تکلیف شب کو مغل سرائے میں اُٹھائی ہے۔ یہاں کی کیفیت مفصل آپ سے انشاء اللہ تعالیٰ زبانی عرض کی جائے گی۔ غالباً پرسوں میں اور احسن بھائی ساتھ ہی یہاں سے روانہ ہوں۔ ۵ تاریخ سراتھو کے اسٹیشن پر سواری کا انتظام آپ کر دیں۔ یہ نہیں کہا جاتا کہ کس ٹرین سے پہنچنا ہوگا۔ باقی خیریت۔ آثم ابو المعظم سراج الدین احمد خاں سائل

آگرہ آباد تشریف لے گئے تو تفریحاً بازار جاتے وقت جناب نوح اور دیگر حضرات ان کے ساتھ مؤدب چلتے تھے جس طرف چلے جاتے تھے لوگ کھڑے ہو جاتے تھے اور ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے تھے۔ تعجب کے ساتھ آپس میں سرگوشیاں کرتے تھے کہ یہ کوئی بہت بڑا حاکم ہے جس کے ساتھ ہمارا تعلقہ دار رئیس بھی مؤدب ہو کر چلتا ہے۔

سائل صاحب کی وضع قطع

قاری عباس حسین صاحب کا ایک مضمون رسالہ "چمنستان" دہلی نومبر ۱۹۴۵ء میں شائع ہوا ہے۔ اس میں سے کچھ اخذ کر کے درج ذیل کرتا ہوں:۔

"مغلئی خد و خال، میدا شہاب رنگ، دراز قد مگر موزوں، سڈول بدن، کسرتی ہاتھ پاؤں، سر بڑا، سر پہ چوگوشیہ لیسدار ٹوپی، پیشانی بلند، سینہ چوڑا، سفید ململ کا انگرکھا، آڑا پاجامہ، پاؤں میں کامدار سلیم شاہی جوتی، حد درجہ وجیہ و شکیل، اطوار میں شرافت گفتار میں شیرینی، یہ تھا آج سے چالیس سال قبل اُن کا حُلیہ، میرا بچپن تھا اور نواب صاحب کی جوانی، والد ماجد قاری سرفراز حسین صاحب عزمی کے ساتھ نواب صاحب کی محلسرا میں حاضر ہوا۔ دربار لگا ہوا تھا، بیچ میں ایک آرام کرسی تھی، ارد گرد مونڈھے، دوست احباب بیٹھے ہوئے تھے۔ نواب صاحب کے آگے پیچوان لگا ہوا تھا۔ نوکر پیچھے کھڑے تھے۔ نواب صاحب مرحوم شاعر تو تھے ہی لیکن وہ شاعر سے زیادہ ایک انسان تھے۔ وہ دہلی کی تہذیب و تمدن کا آخری نمونہ تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ دہلی میں اب مجھے شاہانہ عز و وقار، پُرانی تہذیب و تمدن کا علمبردار، پُرانی وضعداریوں کا حامل کوئی نظر نہیں آتا۔ بے مثل خطاط اور خوشنویس تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ صفحۂ قرطاس پر موتی بکھرے

ہوئے ہیں۔ کڑھائی میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ پتنگ بازی بھی کی ہے بے مثل تکل بناتے اور ڈور سونتتے تھے۔ اچھا کھانا کھاتے اور خوب پکاتے تھے اور کھلا کر خوش ہوتے تھے۔ ان میں وہ تمام کمالات تھے جو اس دور کے رؤسا کے طرۂ امتیاز تھے۔ جس شخص کی نعش پر ہم نے ۱۶ ستمبر ۱۹۴۵ء کو قبل دو پہر منوں مٹی ڈالی ہے وہ کون تھا، پھولوں کی سیج پر سونے والا، اطلس و دیبا کا لباس پہننے والا، باشکوہ و پر وقار انسان۔ جب کبھی کسی مشاعرے کسی مجلس کسی صحبت میں گیا اپنی سج دھج، اپنے رکھ رکھاؤ اور اپنی خوش بیانی کی وجہ سے سب میں ممتاز رہا۔"

راقم الحروف غم نصیب واصف کے بزرگوں سے نواب صاحب مرحوم کے مراسم قدیم تھے مگر تلمذ کے ارادے سے جنوری ۱۹۲۶ء میں نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ فرمایا کہ بیٹا میں تو خود اس قابل ہوں کہ تمھارے باپ سے اصلاح لوں تم مجھ سے اصلاح لینے آئے ہو۔ اس زمانہ میں نواب صاحب کی عمر ۶۲ سال کے قریب تھی۔ ڈاڑھی کے بال بھورے مائل بہ سرخی تھے۔ وجاہت اور شوکتِ جسمانی میں اُن کے ہم پلّہ بہت کم لوگ دیکھے گئے ہیں۔

باوقار اور پُر شوکت چہرہ، سُرخ و سفید رنگ، بھری ہوئی سُنہری ڈاڑھی چوڑا چکلا سینہ، اونچا قد، بڑے بڑے ہاتھ، سر بڑا اور چوڑے چکلے چہرے کی مناسبت سے بڑے بڑے کان، آنکھوں میں کشش، لہجہ میں نرمی اور گفتگو میں انتہائی مٹھاس، شاگردوں کو بالعموم بیٹا کہہ کر خطاب کرتے تھے۔

اکثر سبز اور کبھی سُرخ مخمل کی چوگوشیہ ٹوپی جس پر طلائی لیس ہوتی تھی استعمال فرمایا کرتے تھے۔ قدیم تراش کا ململ تن زیب چکن وغیرہ کا انگرکھا اور چُست دوہرے لٹھے کا آڑا پاجامہ ان کے ڈیل ڈول پر نہایت زیب دیتا تھا۔ ایک مرتبہ فرمایا کہ بیٹا! تم کو معلوم ہے کہ میں دوہرے لٹھے کا پاجامہ کیوں پہنتا ہوں اس میں ایک فائدہ تو یہ ہے

کہ سرد موسم میں کچھ خنکی سے امن رہتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر کہیں بارش وغیرہ میں کپڑے بھیگ جائیں تو اکہرے لٹھے میں سے بھیگ جانے کی وجہ سے جسم کا رنگ ظاہر ہوتا ہے۔ اور ستر محفوظ نہیں رہتا۔ تیسرے یہ کہ اگر اوپر سے ایک نہ کھونچ لگنے کی وجہ سے کہیں پھٹ جائے تو بے ستری نہ ہو۔ اللہ اللہ شرم وحیا اور ستر کا لحاظ ہمارے اسلاف میں کس قدر تھا۔ آج کے انسان کی انسانیت اتنی دردمند اور ناتوان ہو چکی ہے کہ ناتمام اور ادھورا لباس بھی بار معلوم ہونے لگا ہے۔

فراخ دل عالی ظرف اور انتہا درجہ کے متحمل مزاج تھے۔ علمِ عروض کے ماہر تھے۔ شعر و سخن کی تمام اصناف پر قادر تھے۔ چوگان اور شہسواری میں بھی مشہور تھے۔ کڑھائی کی بے مثل مہارت تھی چنانچہ آخر زمانہ میں اکثر اپنے ہاتھ سے ٹوپیاں کاڑھ کر پہنا کرتے تھے۔ تیپچی کے طرز پر رنگین تاگے سے بغیر خاکے کے بہت عمدہ پھول بنایا کرتے تھے۔ معذور ہو جانے کے بعد جب تک نظر قائم رہی کتب خانہ رحیمیہ کے سامنے رکھشا میں یہی مشغلہ رہتا تھا۔

سائل صاحب سے پہلے بالعموم مشاعروں میں ترنّم سے پڑھنے کا رواج نہ تھا۔ یہ پہلے شاعر ہیں جنھوں نے مشاعروں میں ترنّم کی ابتدا کی۔ نہایت بلند بانگ آواز تھی اور آواز میں ایک خاص درد انگیزی تھی۔ آج تک ان کا طرزِ ترنّم کوئی پیدا نہ کر سکا۔ جس مشاعرہ میں سائل صاحب ہوتے تھے صدر انھیں کو بنایا جاتا تھا۔ چنانچہ ہندستان کے آل انڈیا مشاعرے زیادہ تر انھیں کی صدارت میں ہوئے ہیں۔ قدرتی طور پر ان کے حسن و جمال اور شان و شوکت کا رُعب مجمع پر ایسا پڑتا تھا کہ سناٹا چھا جاتا تھا اور غزل پڑھتے تھے تو ہر طرف سے صدائے تحسین بلند ہوتی تھی۔ بڑے بڑے معرکے کے مشاعروں میں خراجِ تحسین حاصل کر لینا سائل صاحب ہی کا حق تھا۔

خوش نصیب واصف کی آنکھوں نے وہ منظر بھی دیکھا ہے کہ مدرسۂ امینیہ دہلی

کے سالانہ جلسہ منعقدہ ۲۵ محرم ۱۳۳۶ھ م ۱۲ نومبر ۱۹۱۷ء میں سائل صاحب شیر کی طرح گرجدار آواز میں کھڑے ہوئے نظم پڑھ رہے ہیں۔ مدرسہ کے در و دیوار گونج رہے ہیں۔ ہزاروں کا اجتماع، آواز کی بلندی اور ترنم سے مسحور ہے۔ چہرہ پر عجیب غریب حسن و جمال اور شگفتگی ہے۔ وہ ترکیب بند مندرجۂ ذیل ہے:۔

حمد خدا کو چاہیے تیری مدد قلم	خدمت سپرد ہے یہ ترے تا ابد قلم
اوّل خدائے پاک نے پیدا کیا تجھے	مرقوم صدر لوح پہ ہے یہ سند قلم
اِتنوں کے سامنے نہ مجھے کر ذلیل و خوار	درخواست میری چاہیے کرنی نہ رد قلم
حمدِ خدائے پاک ہے توشہ معاد کا	یہ لکھ سوائے اس کے نہ لکھ نیک و بد قلم
حق حمد کا تو جب بھی نہ ہوگا ادا اگر	لکھنے کو بیٹھے بندۂ عاجز بصد قلم
لیکن ہے اقتضائے عبادِ نکو شعار	راقم کو جد رقم میں ہو اور تجھ کو کد قلم
السعی منی کہہ کے نگوں سر ہو لوح پر	اللہ کا نام لے کے ذرا کھینچ مد قلم
تو دیکھتا ہے دیکھ رہے ہیں تجھی کو سب	چاروں طرف سے پڑتی ہے نظروں کی زد قلم
حمدِ خدائے عز و جل کے لئے مدام	سر در سجود ہو کبھی ہو سرو قد قلم
امکان تک تو چاہیے اظہارِ بندگی	تحمیدِ حق ضرور ہے تا وسع و جد قلم
تحمیدِ حق میں چاہیے ہونا فنا تجھے	گھس دے طرازِ حمد میں اپنا جسد قلم
مخلوق تجھ کو حق نے کیا دو زبان سے	میری زباں کو تجھ سے نہ کیوں ہو حسد قلم
اسکے سوا ہے رشک و حسد کا سبب اک اور	قول اس کا ہیچ، فعل ترا مستند قلم
بسم آلہ کا ہو ترانہ صریر میں	ہو مد میں ہر کشش کی رقم یا صمد قلم

معبود حمدِ عبد سے گو بے نیاز ہے
بندہ ثنائے حق سے مگر سرفراز ہے

محبوبِ حق کی نعت میں کھل اے زبانِ کلک	ایسے عمل ہیں موجبِ ہستیٔ شانِ کلک

نعتِ حبیبِ پاک خدا میں کھپا دے جان ۔۔۔ گر تند ہی کہ تجھ کو کہیں سب سوانِ کلک
ایسی تو لکھ ثنائے محمد کہ سُن کے سب ۔۔۔ صلِ علیٰ کے تحت میں ہوں مدح خوانِ کلک
ازبس وسیع گو کہ ہے میدانِ حمد و نعت ۔۔۔ جولانیوں سے کھول دے تاب و توانِ کلک
سُن کر صریرِ کلک کو بن جائیں حاضرین ۔۔۔ تاثیرِ نعتِ پاک سے رطب اللسانِ کلک
دنیا و دیں کے حال کے لکھنے سے کب چھپے ۔۔۔ نفع و مضارِ خامہ وسود و زیانِ کلک
وہ نعت لکھ کہ جس کو کہیں سُن کے حاضرین ۔۔۔ لاریب فیہ راست ہے یہ داستانِ کلک
مقبول ایسی نعت رقم کر حبیب کی ۔۔۔ بہر بیاضِ نظم ہو تا ارمغانِ کلک
فصلِ بہار خامہ نمیقت ہے نعت کی ۔۔۔ دنیا کی مدح ساری ہے عہدِ خزانِ کلک
کاغذ وہ جس پہ لکھی ہو نعتِ محمدی ۔۔۔ رتبے میں وہ زمین بنے آسمانِ کلک
جائے ادب ہے نعت بھی ہم رنگ حمدِ رب ۔۔۔ واجب یہاں بھی ہو کہ جھکے فرقدانِ کلک
سب منتظر ہیں نغمۂ وصوتِ صریر کے ۔۔۔ بیٹھے ہیں سب کے سب بہ پئے امتحانِ کلک
مدحت سرائے حضرتِ محبوبِ کبریا ۔۔۔ بنجائے نائے کلک تو ہو امتنانِ کلک
بُلبل سے کم نہیں ہے نوا سنجِ نعتِ پاک ۔۔۔ طوبیٰ کی شاخ شجرہ سے ہے دودمانِ کلک

گلریز یاں یہ نعتِ نبی کی دکھائے گا
مل جائے گا جو وقت تو جی کی دکھائے گا

لائی ہے اب تو کھینچ کے اک محترم طلب ۔۔۔ آنا پڑا مجھے کہ وہ تھی پر کرم طلب
دعوت جو اہلِ علم و خدا آگیں کریں ۔۔۔ کیوں کر نہ سمجھی جائے بھلا محتشم طلب
میری طلب یہ مایۂ صد فخر ہے مجھے ۔۔۔ لیکن ہوئی بہ زمرۂ اہلِ قلم طلب
معقول عذر کرتا ہوں میں ضیقِ وقت کا ۔۔۔ اک ہفتہ پہلے چاہیے تھی کم سے کم طلب
اب منفعل ہوں مجمعِ اہلِ کمال میں ۔۔۔ کہہ دوں کرم طلب نہیں ہے یہ ستم طلب
نیت کو جانتا ہوں صفا باطنوں کی میں ۔۔۔ یہ بھی مری طلب ہے بہ لطفِ اتم طلب

اس کا بھی ہے یقین مجھے ان کی ذات سے
ہو گی گناہگار کی اب دم بہ دم طلب

سر کو قدم بنا کے یہاں آؤں گا مدام
کھالوں قسم بھی آپ کریں گر قسم طلب

بھیجا نہ جائے نامہ و پیغام سرو قیع
سائل ہوں میں نہیں ہوں میں جاہ و حشم طلب

قربان اس طلب کے، نثار اس طلب کے میں
ہوں مجھ سے بد بزمرۂ خیر الامم طلب

میری طلب میں اب ہے اس امر کا خیال
یعنی مری طلب ہو بوجہ اتم طلب

میں حاضری کا حق بھی تو کچھ کر سکوں ادا
ہستی طلب کی میری بنے کیوں عدم طلب

اتنا تو وقت چاہیئے دینا کہ بہر نظم
کاغذ طلب قلم ہو تو کاغذ قلم طلب

داعی سے کر رہا ہوں مکرر یہ التماس
ہو میری اس طرح سے نہ پھر ایکدم طلب

اعضار کے لئے رہی ارشاد پر نظر
اک لمحہ بھی پڑی نہیں رُوداد پر نظر

تفصیل مدرسے کی دُعا کے سوا ہو کیا
اسکی بقا کی آس خدا کے سوا ہو کیا

تعمیر کی یہ شکل توکل کی شرح ہے
کلمہ زباں پہ دیکھ کے جز مرحبا ہو کیا

کیسی لطیف اس کی عمارت کی شکل ہے
اس پُر فضا فضا سے فزوں تر فضا ہو کیا

حضرت امین دین و کفایت کا دم رہے
تعریف قلب ان کے دلوں سے صفا ہو کیا

خدمت میں دین کی ہیں یہ دن رات منہمک
دینی وفا میں اس سے زیادہ وفا ہو کیا

کتنی بلند اس کی عمارت ہے شاندار
حیراں ہوں اور معنیِ اوج و علا ہو کیا

سب حاضریں کو چاہئیں کرنی عنایتیں
درخواست اور کیا کروں اور التجا ہو کیا

دارین میں بھلا ہو جو حامیِ دیں رہے
ایسی دعائے خیر سے بہتر دعا ہو کیا

روشن چراغِ دینِ محمدؐ رہے مدام
ضو پاش اس سے بڑھ کے کسی کی ضیا ہو کیا

جتنی کسی سے ہو سکے اس کی مدد کرو
کونین میں خبر نہیں اجرِ سخا ہو کیا

حرفِ سوال لب پہ یہاں آئے کس طرح
سائل یہ گھر خدا کا ہے اس میں صدا ہو کیا

بدنصیب واصف کی آنکھوں کے سامنے سے وہ منظر بھی گذرا ہے کہ وہی ہزاروں کے اجتماع میں بغیر لاؤڈ اسپیکر کے گرجنے والا شیر ۱۹۴۲ء میں کتب خانہ رحیمیہ پر رونق افروز ہے ضعف و نقاہت کی وجہ سے سرنگوں ہے اختلاجِ قلب سے کبھی کبھی بے قراری ہو جاتی ہے۔ اتنے میں حضرت مفتی صاحب تشریف لاتے ہیں فوراً مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھتے ہیں فرماتے ہیں کہ حضرت مفتی صاحب! چند اشعار کہے ہیں اگر حکم ہو تو عرض کروں۔ مفتی صاحب فرماتے ہیں ارشاد فرمائیے۔ نحیف اور درد انگیز آواز میں چند اشعار سناتے ہیں :-

انھیں جان کر رنج و غم جانتا ہوں عنایت کو ان کی ستم جانتا ہوں
محن سے ہوں واقف الم جانتا ہوں گراں جاں ہوں یہ کم سے کم جانتا ہوں
حقیقت جو عشق و محبت کی پوچھے کم از کم یہ کہہ دینا لازم ہے اس سے
زبوں تر ہیں معنی و اوصاف اس کے ازاں جملہ اک جسمِ نم جانتا ہوں
رہِ عشق و الفت میں جو گامزن ہے وہ ہمدوشِ آفات رنج و محن ہے
ہر اک منزل اس کی کٹھن پُر فتن ہے میں اُس کی ہوا زہر و سم جانتا ہوں
ابھی بحرِ غم میں ہے دل کو ڈبونا ابھی اشکِ حسرت سے ہے مونھ کو دھونا
ابھی ٹھوکریں کھا ہے اس رہ میں رونا کہ آگے کی منزل اہم جانتا ہوں
کرے گا نشانہ خطا تیر زن تو جھپکنے نہ دے دیدۂ سحر فن تو
مژہ راست کر مان میرا سخن تو میں اس تیر میں تیرے خم جانتا ہوں
ہدایت ہے بھولا ہوا سا فسانہ ہوں قیدِ نشیب و فرازِ زمانہ
رہا ہوں تو ہے اور آگے بھی جانا حقیقت نہایت کی کم جانتا ہوں
نہ پوچھو کہ تدبیر چلنے کی کیا کی فقط دیر باقی ہے امرِ خدا کی
ضرورت نہیں رہبر و رہنما کی کہ میں راہِ ملکِ عدم جانتا ہوں

درِ پیرِ میخانہ کا ہوں گدا میں وہیں کھاتا پیتا ہوں اس کا دیا میں
وہیں زینا رہتا ہوں سائلؔ صلہ میں اُسے اہلِ بذل و کرم جانتا ہوں

۱۹۳۵ء میں جبکہ نواب صاحب محلہ فراش خانہ میں حکیم عبدالرشید خاں کے مکان میں کرایہ پر رہتے تھے۔ ایک روز بازار میں کسی جگہ راقم الحروف کو دیکھ کر پکارا۔ اور فرمایا حضرت آرزوؔ لکھنوی آئے ہوئے ہیں آج شام کو تم کھانا میرے ساتھ کھالینا۔ میں نے عرض کیا بسروچشم! شام کو درِ دولت پر حاضر ہوا۔ جناب آرزوؔ لکھنوی سے نیاز حاصل ہوا۔ استاد مرحوم نے تعارف کرایا۔ فرمایا یہ میرا ہونہار شاگرد ہے اور مرشد زادہ ہے۔ کھانے سے قبل جناب آرزوؔ اپنا کلام سُناتے رہے۔ آپ نے اپنی اس خصوصیت کا اظہار فرمایا کہ میں فارسی عربی کے الفاظ سے بچ کر کہتا ہوں۔ اس مجلس میں انھوں نے اپنی پانچ چھ غزلیں سنائیں۔ ان میں عربی فارسی کے الفاظ بالکل نہ تھے۔ بھاشا سے نکلی ہوئی خالص اُردو تھی۔ باوجود اس کے تخیل کی بلندی، مضامین کی شگفتگی، زبان کی فصاحت و دلفریبی بدرجۂ اتم موجود تھی۔

سائل صاحب کا مذہب اور سیاسی مسلک

سائلؔ صاحب اہل سنت والجماعۃ اور خالص حنفی مسلمان تھے۔ حضرت شاہ دلدار علی مذاقؔ شاگرد ذوقؔ مرحوم سے آپ کو بیعت تھی۔ مگر غلو نہ رکھتے تھے اور متصوفانہ بے تعصبی کے حامل تھے۔ ایک روز فرمایا کہ میں تفضیلی سُنّی ہوں۔ میں نے عرض کیا تفضیلی سُنّی سے کیا مراد ہے، تفضیل تو شیعیت کی ایک شاخ ہے۔ فرمایا کہ میں حضرت علیؓ کو اصحابِ ثلٰثہ پر فضیلت دیتا ہوں۔ میں نے عرض کیا حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اصحابِ ثلٰثہ رضوان اللہ علیہم پر فضیلت دینے کا اختیار آپ کو کس نے دیا۔ نیز یہ کہ سُنّی ہو کر آپ تفضیلی کیسے بن سکتے ہیں۔ یا تو یہ کہیے کہ میں تفضیلی شیعہ ہوں یا کہیے کہ میں

پکا سُنّی ہوں یہ دو رُخی بات کیسی ؟ مذہب اہلِ سُنّت میں تمام علمار کا اتفاق اس امر پر ہے کہ خلفائے راشدین کا تفضل اُن کی خلافت کی ترتیب کے لحاظ سے ہے۔ فرمایا کہ بھئی میں اپنے آپ کو شیعہ کہنے کے لئے تو تیار نہیں ہوں۔ میں نے عرض کیا کہ مغلوں کے زمانے میں ہندوستان پر ایرانیوں کا اس قدر غلبہ رہا کہ امورِ سلطنت میں بھی دخیل رہے اور رشتہ داریوں کی وجہ سے معاشرت پر بھی چھائے ہوئے تھے۔ اس کا اثر مذہبی رجحانات پر پڑنا لازمی تھا۔ پُرانے پکّے سُنّی بھی ڈگمگا گئے اور تبرائی شیعہ نہیں تو کم از کم تفضیلی بن گئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا قول بھی اسی تأثر کی وجہ سے ہے۔ پھر میں نے کچھ تفصیل سے بعض پہلو مدلّل طور پر گوش گذار کیے۔ فرمایا کہ اب میرا شبہ دُور ہو گیا واقعی میں غلطی پر تھا۔ یہ محض ایک رسمی چیز تھی ورنہ درحقیقت اُستاد مرحوم پکّے سنّی تھے اور انھوں نے بارہا مجھ سے فرمایا ہے کہ "ہمارے اسلاف نے یزید پر لعنت بھیجنے سے منع کیا ہے۔ یہ فعل ہمارے مسلک کے خلاف ہے۔"

سیاسی مسلک کے متعلق یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ نہ رجعت پسند تھے نہ انتہا پسند بلکہ معتدل تھے۔ اُن کا خاندان نواب احمد بخش کے زمانے سے سرکار انگریزی کا وفادار رہا ہے۔ نواب احمد بخش کا زمانہ وہ زمانہ تھا جبکہ تمام ہندوستان پر انگریز متسلّط ہو چکے تھے اور تمام ملک کا نظم و نسق انگریزوں کے پنجۂ استبداد میں آ چکا تھا۔ نواب احمد بخش خاں سے انگریزوں کے ذاتی مراسم اور دوستانہ تعلقات بھی تھے۔ ان کی خدمات کے عوض اُن کو فیروز پور اور لوہارو کی جاگیریں بھی ملی تھیں۔ اُن کے انتقال کے بعد اُن کے بڑے صاحبزادے نواب شمس الدین احمد خاں ان کے جانشین ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ انگریزوں کے تسلّط و اقتدار اور تشدد و مظالم سے رعایا میں نفرت کے جذبات پیدا ہو رہے تھے اور اپنی جگہ پر ہر شخص اپنی غلامانہ زندگی سے

اذیت محسوس کر رہا تھا۔ نواب شمس الدین احمد خاں کے متعلق انگریز مؤرخوں نے لکھا ہے کہ وہ نہایت بدچلن اور فتنہ انگیز نواب تھا۔اس کی وجہ یہ ہے کہ سر ولیم فریزر سے جو اس زمانے میں دہلی کے ایجنٹ تھے نواب کی مخالفت ہوگئی تھی اور کہا جاتا ہے کہ سر ولیم فریزر کے قتل میں نواب کی اشتعالک تھی۔ یہ انگریز مورخوں کی فطری عادت ہے کہ وہ آزاد خیال اور محبِ وطن انسان کو بدچلن اور فتنہ انگیز کے لفظ سے ہی یاد کرتے ہیں اور غدارانِ وطن کو نیک چلن، خوش اطوار، وفادار اور دنیا بھر کے مشفقانہ خطابات سے یاد فرمایا کرتے ہیں۔ ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی کو غدر کا لقب دیا جاتا ہے چنانچہ نواب شمس الدین احمد خاں کو ۱۸۳۵ء میں (یعنی ظلِ سبحانی بہادر شاہ ظفر کی تخت نشینی سے دو سال قبل) پھانسی دیدی گئی۔ انگریزوں کا اقبال اس قدر عروج پر تھا کہ نواب کا نام لینا بھی گناہ سمجھا جاتا تھا۔ نواب بیچارا کس شمار میں تھا مغلوں پر جنھوں نے صدیوں ہندوستان پر شہنشاہی کی اور دنیا پر اپنے جاہ وجلال کا سکہ بٹھا یا ایک زمانہ وہ آیا کہ آخری مغل بادشاہ پر بغاوت کا الزام لگاکر اسی کے لال قلعہ میں خود اسی پر مقدمہ چلایا جاتا ہے (کس پر؟ بادشاہ پر؟ بغاوت کا الزام! یاللعجب!) اور کون مقدمہ چلاتا ہے؟ سات سمندر پار کی ایک سوداگر قوم! اور کوئی شخص کہیں شارع عام پر بادشاہ کا نام تک لینے کی جرأت نہیں رکھتا تھا۔ تمام ملک اور بالخصوص مسلمان بالکل مغلوب ہو چکے تھے۔ اس وقت کے لیڈروں اور زعمائے قوم نے مجبوراً یا تو گوشہ نشینی کی پالیسی اختیار کی یا تعاون کا مسلک پسند کیا کیونکہ اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا۔ ریاست نواب امین الدین احمد خاں کے خاندان میں منتقل ہوگئی تھی۔ سائل صاحب کا خاندان ریاست سے منصب کا تعلق رکھتا تھا۔ اس وجہ سے بھی اور عام پالیسی کے ماتحت نواب ضیاء الدین احمد خاں کی بھی تعاون کی پالیسی رہی۔ سائل صاحب بھی چونکہ اسی زمانے کے پرانے بزرگوں میں سے تھے ان کے رجحانات

بھی وہی تھے۔ اگرچہ انھوں نے علانیہ تعاون کی پالیسی اختیار نہیں کی۔

غرضکہ سائل صاحب عملی طور پر سیاست میں کوئی حصّہ نہ لیتے تھے بلکہ صاف بات تو یہ ہے کہ اُن کو سیاست سے قطعاً کوئی دلچسپی ہی نہ تھی۔ ۱۹۲۰ء کی تحریک کے زمانہ میں انھوں نے ایک طویل ترجیع بند میں اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ جس میں سے کچھ اشعار درج ذیل کرتا ہوں:-

دعوئے وفا کا جن کو ہے ہم سے سوا غلط
سمجھے ہیں لوگ معنئ حرفِ وفا غلط

بیڑا امیدِ خلق کا کیوں کر نہ ہو تباہ
جس کے سرے سے ہو گئے ہوں ناخدا غلط

جاں بر مریض ہو نہیں سکتا کسی طرح
جب اس کے چارہ گر اسے دیں گے دوا غلط

لیڈر وہ قوم کے ہیں جو ہیں تاج کے خلاف
مطلب یہ لیڈری کا ہے بے انتہا غلط

عمالِ تاج کیا کریں جز نظمِ حادثات
پاداشِ جرم جو ہو وہ کب ہے سزا غلط

جو مانگنا ہے مانگو جو کہنا ہے وہ کہو
اسلوبِ طرزِ غیر ہے صوت و صدا غلط

خواہش جو ہے تمھاری ہماری بھی ہے وہی
ہم سے عمل کوئی نہیں سرزد ہوا غلط

منّت سے مدّعا کی کرو خواستگاریاں
ہاتھی پہ چڑھ کے مانگنا ہے نارَوا غلط

مقصود ہے فلاح اگر قوم کی تمھیں
لازم ہے رکھنی ٹھیک خبر قوم کی تمھیں

اخلاس کی نگاہِ عنایت ہے قوم پر
تم سے چھپی نہیں جو مصیبت ہے قوم پر

قحطِ معاش و قحطِ نکوئی و قحطِ رزق
قحطوں میں ہے گھری ہوئی حسرت ہر قوم پر

بے دولتی نے دیکھ لیا ہے غریب کو
ٹوٹی حیات میں یہ قیامت ہے قوم پر

حالانکہ قحطِ رزق ہے ہوتی ہیں دعوتیں
یہ مستحب ہے فرض ہے سنّت ہے قوم پر

ہوتے ہیں انصرام جلوسِ فضول کے
رکھنا نہ باز جس سے شقاوت ہے قوم پر

دس لاکھ کی طلب ہے پئے صرفِ فنڈ
چندے کے واسطے یہ ہدایت ہے قوم پر

سرگرمیاں ہوں جتنی مدارات کے لئے
ان لیڈروں کے واسطے منت ہے قوم پر
سیکھو سبق خلوص کے حسرت کی ذات سے (مراد حسرت موہانی)
پرہیز کرنا چاہیے اس واہیات سے

یا سادگی سے کیجے دفا قوم کے لئے
یا نیم شب کو دیجے دعا قوم کے لئے
لازم نہیں کہ نذر وہ ریّال کی کریں
چوری سے پورکی جو بچا قوم کے لئے
فرمان ہائے سابق شاہی پڑھو ذرا
ان کی بنا پہ کیا نہ ہوا قوم کے لئے
اعلان تاجِ حال پہ بھی چاہیے نظر
منشا تمہارا اور رہے کیا قوم کے لئے
مقصد سے متفق ہیں عمل کے ہیں ہم خلاف
تدبیر یہ نہیں ہے بجا قوم کے لئے
گاندھی کا قول یہ کہ نہ ملکی رہیں خلاف
ظاہر میں گو مفید ہوا قوم کے لئے
یہ دیکھنا ہے رہتا ہے کب تک قرار اسے
سہو آگے ہندو کرتے ہیں یا دیندار اسے

دینی ہے اب تو دعوتِ امن و اماں ہمیں
کرنا نہیں ہے وقت عبث رائیگاں ہمیں
کچھ عرض حال کرنا ہے تکلیفِ خلق کا
مذکور جن کے ہوتے ہیں از بس گراں ہمیں
یہ تو ہماری ذات پہ گذری ہے واردات
دُہرانی جس کی پڑتی ہے اب داستاں ہمیں
ہڑتال کے عروج کا قصہ بیاں ہو کیا
جس نے عطا کیا ہے غمِ جاوداں ہمیں
نورِ نگاہ لختِ جگر شیر خوار پور
کرنا پڑا زمین کے نیچے نہاں ہمیں
اک بوند بھی دوا کی نہ جس کو ہوئی نصیب
ہڑتال کے یہ ذاتی ہوئے امتحاں ہمیں
مخلوق کی صعوبتیں جو گوش زد ہوئیں
بے حد و بے شمار ہوئیں لاتعد ہوئیں
جانیں بہت سی نذر ہوئیں اس خیال کی
تا اینکہ نوبت آچکی قتل و قتال کی
باغی خطاب پاچکے بے زست شیدائے ہند
ڈگری ہے اور باقی کوئی ابتذال کی

لندن میں ہے خلافتِ دینی کا وفد بھی | حسرت تمام ہوئی جواب و سوال کی
ماضی پہ خاک ڈال کے ایسی ڈگر چلیں | پیدا ہوں جس سے راہیں بہم اعتدال کی
مشکل نہیں ہے تاج سے کچھ رفعِ سوءِ ظن | ٹوئیں بدل لی جائیں اگر بول چال کی

ہو جائے گا سلوک رعایا و شاہ میں
تخفیف و قر میں نہ کمی آئے جاہ میں

جلسہ مصالحت کا کوئی تم قرار دو | آرائے عام لے کے شہنشہ کو تار دو
سطوت کو تاج کی رکھو ملحوظ وقتِ عرض | دینا ہو جو پیام نہ وہ ناگوار دو
اپنے حقوق مثلِ رعایا طلب کرو | با شوق یہ کہو کہ ہمیں اختیار دو
معتوب ہیں جو تاج کے ان کے بنو شفیع | ان کی رہائی کے لئے دامن پسار دو

اس کی جزا نہ پاؤ تو پھر تم مجاز ہو
اب تو خدا کے واسطے عرضِ نیاز ہو[۱]

ایک روز مجھ سے فرمایا کہ "بیٹا! درد میرے دل میں بھی اٹھتا ہے مگر میں آہ بھی نہیں کر سکتا۔ ایک دفعہ ایک نظم جامع مسجد میں پڑھ دی تھی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اوپر سے بڑی تار ڈپڑی اور لینے کے دینے پڑ گئے۔ اس وقت سے کان پکڑا کہ اب کوئی سیاسی نظم نہ کہوں گا"۔

استاد مرحوم نے جس نظم کی طرف اشارہ کیا ہے وہ وہ معرکۃ الآرا تضمین ہے جو انھوں نے مولانا شبلی نعمانی کی نظم پر جنگِ بلقان کے زمانہ میں کہی تھی۔ یہ تضمین سائل صاحب نے جامع مسجد دہلی کے ایک عظیم الشان جلسہ میں سنائی تھی۔ لوگ دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ وہ یہ ہے :-

دعائے عافیت مانگے گا زینِ خستہ جاں کب تک | مخالف گردشیں کرتا رہے گا آسماں کب تک

---

[۱] واقعاتِ دارالحکومت دہلی جلد اول ص ۱۰۳۰

سنائے گا بتا اے کوکبِ نامہرباں کب تک   حکومت پر زوال آیا تو پھر نام و نشاں کب تک
چراغِ کشتۂ محفل سے اُٹھے گا دھواں کبتک

بڑھے گر چار سو سے سوئے دامن آہنی پنجے   پکڑ کر گوشۂ دامن ستمگاروں نے گر کھینچے
رہے گی تاج و تختِ روم کی پھر آبرو کیسے   قبائے سلطنت کے گر فلک نے کر دیئے پرزے
فضائے آسمانی میں اُڑیں گی دھجیاں کبتک

سُنے کوئی تو ہم اس سے کہیں بھی مدعا یہ ہے   مصیبت اپنے اوپر یہ پڑی ہے ماجرا یہ ہے
یہ دل میں درد پیدا ہو گیا ہے عارضہ یہ ہے   مراکش جا چکا فارس گیا اب دیکھنا یہ ہے
کہ جیتا ہے یہ ٹرکی کا مریضِ نیم جاں کبتک

یہ خیل مانٹی میدان سے جو بڑھتا آتا ہے   قشونِ سرویہ اس شان سے جو بڑھتا آتا ہے
سحابِ جیش اب یونان سے جو بڑھتا آتا ہے   یہ سیلابِ بلا بلقان سے جو بڑھتا آتا ہے
اسے روکے گا مظلوموں کی آہوں کا دھواں کبتک

خبر ہے اپنے بیگانے ہیں کیا کیا دیکھنے والے   مرادِ غیر یا اپنی تمنا دیکھنے والے
کیے بیٹھے ہیں بند آنکھوں کو مانا دیکھنے والے   یہ سب ہیں رقصِ بسمل کا تماشا دیکھنے والے
یہ سیر ان کو دکھائے گا شہیدِ خستہ جاں کبتک

یہ صوتِ درد ہے مرغوب کن کو کن کو بھاتی ہے   صدائے ماتم کی دل خوش کن ہے انکی ان کو بھاتی ہے
یہی یہ رات کو سُنتے ہیں یہی دن کو بھاتی ہے   یہ وہ ہیں نالۂ مظلوم کی لے جن کو بھاتی ہے
یہ راگ ان کو سنائے گا یتیمِ ناتواں کبتک

کسی ترکیب سے آخر ہمیں معلوم کچھ ہو تو   کوئی ہمدرد اپنا ہو کوئی دلسوز اپنا ہو
تو اک پیغام پہنچانے کی ہم تکلیف دیں اسکو   کوئی پوچھے کہ اے تہذیبِ انسانی کے اُستادو
یہ ظلم آرائیاں تا کے یہ حشر انگیزیاں کبتک

سنائی کے نہ ہونے کی کہو تو انتہا تا کے   کیے جائے گا اک رنجور فریاد و بکا تا کے

یہ جوشِ انگیزیٔ طوفانِ بیداد و بلا تا کے
ہوئے جائیگا اک مظلوم پر جور و جفا تا کے
یہ لطف اندوزیٔ ہنگامۂ آہ و فغاں کبتک

نہیں رہنے کی شے یہ جان تو اک دن تو جانی ہے
ہماری بھی تمھاری بھی قضا اک روز آنی ہے
یہ مانا تم کو تلواروں کی تیزی آزمانی ہے
سنا بھی تم نے یہ اتمامِ حجت کی کہانی ہے
ہماری گردنوں پر ہوگا اس کا امتحاں کبتک

مسلماں لاش بے سر پیر گر تم نے نہیں دیکھی
کبھی حالت کسی کی غیر گر تم نے نہیں دیکھی
نگارستانِ خوں کی سیر گر تم نے نہیں دیکھی
دکھا تو دی تمھیں اب خیر گر تم نے نہیں دیکھی
تو ہم دکھلائیں تم کو زخمہائے خوں فشاں کبتک

پٹے لاشوں سے کے کے میل میداں چاہئیں تم کو
بلاد و مصر کے نذرانۂ ویراں چاہئیں تم کو
یہ مانا گرمیٔ محفل کے ساماں چاہئیں تم کو
کہو تو کتنے پُر گنتی میں زنداں چاہئیں تم کو
دکھائیں ہم تمھیں ہنگامۂ آہ و فغاں کبتک

کلیجے میں کوئی چٹکی سی لیتا ہے مسلتا ہے
زباں سے حرف بھی گر قصۂ غم کا نکلتا ہے
یہ مانا قصۂ غم سے تمھارا جی بہلتا ہے
ہمارے حال پر عالم کفِ افسوس ملتا ہے
مگر تم کو سنائیں درد دل کی داستاں کبتک

غمِ جانکاہ ہے ہم کو ہماری نونہالی کا
ہوا جاتا ہے قامت خم ہری سرسبز ڈالی کا
یہ مانا تم کو شکوہ ہے فلک سے خشک سالی کا
ٹھکانا کیا تمھارے جورِ بے رادِ خیالی کا
ہم اپنے خون سے سینچیں تمھاری کھیتیاں کبتک

کرو انسانیت کی بات بھی تم ہو اگر انساں
جو دشواری ہماری ہے اُسے سمجھے ہو تم آساں
عروسِ بخت کی خاطر تمھیں درکار ہے افشاں
تم اپنی زیبِ زینت کے نکالو اور کچھ ساماں
ہمارے ذرہ ہائے خاک ہونگے زرفشاں کبتک

دگرنہ ہم کہاں اور انصرامِ فتحِ ایوبی
قضا کے ہاتھ میں تھا انتظامِ فتحِ ایوبی

نہ لو تیرہ صدی کے بعد نامِ فتحِ ایوبی   کہاں تک لو گے ہم سے انتقامِ فتحِ ایوبی
دکھاؤ گے ہمیں جنگِ صلیبی کا سماں کب تک

سمجھ کر یہ کہ یورپ بھر کے اندر ناتواں ہیں ہم   سمجھ کر یہ کہ بیمار و نزار و نیم جاں ہیں ہم
سمجھ کر یہ کہ گھڑی ساعت کے گویا میہماں ہیں ہم   سمجھ کر یہ کہ دھندلے سے نشانِ رفتگاں ہیں ہم
مٹاؤ گے ہمارا اس طرح نام و نشاں کب تک

نہ بازو میں توانائی نہ تن میں تاب و طاقت ہے   بزرگوں کی نشانی تم میں باقی اک شجاعت ہے
اسی سے کام لینا چاہیے، یہ وقتِ ہمت ہے   زوالِ دولتِ عثماں زوالِ شرع و ملت ہے
عزیزو! فکرِ فرزند و عیال و خانماں کب تک

بزرگوں کی نشانی تم میں باقی اک شجاعت ہے   شجاعت دوسرے مفہوم میں بھی ہے وہ ہمت ہے
یہاں موقع اسی کا ہے کہ دولت کی ضرورت ہے   زوالِ دولتِ عثماں زوالِ شرع و ملت ہے
عزیزو! فکرِ فرزند و عیال و خانماں کب تک

سمجھ سے کام گر تم لو تو پھر دشواریاں کیا ہیں   نہ سمجھو جان کو جب جان پھر ناچاریاں کیا ہیں
یہ چالیں کونسی چالیں ہیں یہ مکاریاں کیا ہیں   خدارا تم یہ سمجھے بھی کہ یہ تیاریاں کیا ہیں
نہ سمجھے اب تو پھر سمجھو گے تم یہ چیستاں کب تک

اگر شمشیرِ غازی کا دلِ مشرک سے ڈر اٹھے   تو سرکوبی کو اس کی گوشۂ عالم سے سر اٹھے
نہ آئے وقت وہ یارب کہ بیٹھے خیر، شر اٹھے   پرستارانِ خاکِ کعبہ دنیا سے اگر اٹھے
تو پھر یہ احترامِ سجدہ گاہِ قدسیاں کب تک

کرو جو ہوتا آیا ہے تمھارے جد و آبا سے   لہو اُن کا پیو جو ہیں تمھارے خون کے پیاسے
خدارا دولتِ عثماں کو مٹنے دو نہ دنیا سے   جو گونج اٹھے گا عالم شورِ ناقوسِ کلیسا سے
تو پھر یہ نغمۂ توحید و گلبانگِ اذاں کب تک

تباہ اسلام کی دو دو سلطنتیں کیسی ہوئیں نامی   سبب کیا تھا یہی نقصانِ ہمت عقل کی خامی

الٰہ العالمیں اس معرکے میں ہو نہ ناکامی   بکھرتے جاتے ہیں شیرازۂ اوراقِ اسلامی
چلیں گی تُند بادِ کفر کی یہ آندھیاں کبتک

سوئے بیت المقدس رہزنوں کی صف آرا ہیں   کلیسا ہیں زیادہ کم مقدس خانقاہیں ہیں
مسلمانوں کی ناصر ہیں تو خالق کی پناہیں ہیں   حرم کی سمت بھی صید افگنوں کی جنب نگاہیں ہیں
تو پھر سمجھو کہ مُرغانِ حرم کا آشیاں کبتک

کدھر ہم دل کے بہلانے کو زیرِ آسماں جائیں   ملے آرام و راحت کی جگہ تو ہم وہاں جائیں
کہاں سائل بتا دو چھوڑ کر ہندوستاں جائیں   جو ہجرت کر کے بھی جائیں تو شبلی ہم کہاں جائیں
کہ اب امن و امانِ شام و نجد و قیرواں کبتک

الحاق

مسیحا تم بنو نعروں میں ہو تاثیرِ قُم پیدا   نئے سر سے ہوں پھر اسلام کے آثارِ گُم پیدا
جہادِ نفس کرنے کو سوئے دنیا ہیں تم پیدا   کرو معنیٔ نصِّ اِنَّمَا اَموالُکُم پیدا
محبت مال سے رکھو گے اے پیر و جواں کبتک

سوال ایک اور سائل کا ہے سب آسودہ حالوں سے   ہیں جتنے مست جامِ عیش کے رنگیں خیالوں سے
وطن کے نوجوانوں سے چمن کے نونہالوں سے   اشارہ صاف ہے یہ قومی قرضہ دینے والوں سے
رکھو گے جیب میں چاندی کے گتّوں کو نہاں کبتک ۱؎

طریقۂ اصلاح اور ادبی مسلک

فرماتے تھے اُستاد کو لازم ہے کہ شاگرد کی قابلیت اور صلاحیت و رجحانِ طبع کے مطابق اصلاح دے نیز یہ کہ جہاں تک ہو سکے شاگرد کے کلام میں کم سے کم تنسیخ کرے۔

راقم الحروف نے ایک مرتبہ عرض کیا کہ مجھے داغ کی روش سے اختلاف ہے۔ نیز یہ

۱؎ سلکِ مروارید صہ ۱۳

کہ زبان اور لغات و محاورات اور قوافی وغیرہ کے متعلق انھوں نے جو قیود عائد کی ہیں ان کی اگر پابندی کی جائے تو اردو ادب کا دائرہ بہت تنگ ہو جاتا ہے۔ فرمایا "بیشک استاد داغ کی مقرر کی ہوئی حدود کا میں بھی پابند نہیں ہوں۔"

استاد داغ نے لفظ "اور" کو بروزن "جب" ناجائز قرار دیا ہے اور بروزن "غور" جائز رکھا ہے۔ سائل نے دونوں طرح استعمال کیا ہے۔ چنانچہ ان کی مشہور غزل کا مطلع ہے:-

ملے غیروں سے مجھ سے رنج، غم یوں بھی ہے اور یوں بھی
وفا دشمن جفا جو کا ستم، یوں بھی ہے اور یوں بھی (سائل دہلوی)

شروع سے آخر تک غزل کی ردیف میں لفظ "اور" ایک سبب خفیف کی صورت میں استعمال ہوا ہے، داغ نے لفظ "میں" (ضمیر متکلم) کو بہ اظہار یا و نون غنہ ایک سببِ خفیف قرار دیا ہے۔ اور صرف میم متحرک باسقاطِ یا و نون کو جائز رکھا ہے مگر سائل نے دونوں طریقوں سے جائز رکھا ہے۔

مرے نامۂ شوق کی سطر میں ہے جگہ اک جو سادہ وہ مہمل نہیں ہے
میں ہو جاؤں خدمت میں حاضر ابھی خود بتانے کو اس کے معانی کہو تو (سائل)

نظامِ دکن میر عثمان علی خان ۱۹۲۸ء میں جب دہلی تشریف لائے تھے تو ادبی دنیا میں بڑی دھوم دھام ہوئی تھی۔ شعراء نے قصیدے اور تہنیت نامے لکھے۔ راقم الحروف نے بھی ایک مسدس لکھا تھا جس اخبار میں وہ شائع ہوا تھا وہ اخبار لے کر استاد مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اسی اخبار میں ہندوستان کے ایک مشہور شاعر کا مسدس بھی تھا اس کا ایک بند یہ ہے:-

مژدہ اے دہلی! شمیمِ شہریاری آگئی — رقص کرتی ناز سے بادِ بہاری آگئی
تیرے خوش ہونے کی صدیوں بعد باری آگئی — دیکھ وہ عثماں علی خاں کی سواری آگئی

پستیوں کو منزلِ رفعت کا زینہ مل گیا
سر اٹھا! تیری انگوٹھی کا نگینہ مل گیا

اُستاد مرحوم نے میری طرف اخبار بڑھا کر فرمایا کہ بتاؤ ٹیپ کے شعر میں کیا سقم ہے۔ میں نے کچھ تامل کیا مگر سمجھ میں نہ آیا۔ فرمایا "تاجِ دولت بر سرت" والا قصہ یاد ہے؛ تھوڑی دیر غور کرنے کے بعد میں نے عرض کیا کہ "سر اٹھانے" کے معنی "بغاوت" کے بھی ہیں۔ بہت خوش ہوئے۔ فرمایا کہ چونکہ اس محاورے میں دوسرے معنی کا ایہام بھی ہوتا ہے جو آدابِ شاہی کے خلاف ہیں اس لئے شاعر کو اس اندازِ بیان سے احتراز چاہیے تھا۔

بالعموم شاگردوں کو اور خاصکر مجھے اصلاح دینے کا طریقہ یہ تھا کہ شاگرد پر ہی غور کرنے اور اپنی اصلاح آپ کرنے کی ذمہ داری ڈالتے تھے۔ فرماتے تھے کہ تم خود غور و فکر کی عادت ڈالو۔ میں نے اگر تمھاری غلطی کو بغیر تمھارے سمجھے ہوئے درست کر دیا تو تمھیں کیا فائدہ پہنچا۔

کبھی شاگرد کے رجحانِ طبع کو بدلنے کی کوشش نہیں کرتے تھے بلکہ اکثر محض فنی اور لسانی اغلاط کو درست کیا کرتے تھے۔

۱۹۴۳ء میں ہندوستان کے چند ادبی رسائل میں جن میں رسالہ "شاعر" آگرہ پیش پیش تھا ایک ادبی بحث لفظ شروعات کے متعلق چھڑی۔ ایک صاحب نے اپنے کلام میں لفظ شروعات کو استعمال کیا اس پر رسالہ "شاعر" نے اعتراض کیا۔ یہ بحث کافی دلچسپ تھی۔ دورانِ بحث میں کچھ تلخ طرزِ تحریر بھی اختیار کر لیا گیا تھا اور یہ چیز ادبی اور علمی ذوق کے لئے نامناسب تھی۔ "شروعات" لفظ شروع کی جمع بنائی گئی ہے۔ گو عربی میں اس طریقہ سے مستعمل نہ ہو مگر ایسے بے انتہا الفاظ ہیں جو اپنی اصل کے اعتبار سے کچھ اور صورت رکھتے ہیں اور ہماری زبان میں آکر کچھ کے کچھ

ہو جاتے ہیں اور فصحا نے ان کو اپنی ادبی تحریروں اور تقریروں میں جگہ دی ہے مثلاً لفظ متلاشی (ذوق نے بھی استعمال کیا ہے) ترکی لفظ تلاش سے عربی باب تفاعل کا اسم فاعل بنایا ہے۔ نزاکت فارسی لفظ نازک سے عربی قاعدہ سے تائے مصدری بڑھا کر مصدر بنایا ہے۔ رہائش بمعنی سکونت اردو لفظ رہن یا رہنا سے بقاعدۂ فارسی شین مصدری بڑھا کر مصدر بنایا ہے۔ اس قسم کے الفاظ کے متعلق کہا جائیگا کہ ہماری زبان میں آکر کچھ تصرف کے بعد مہند ہو گئے ہیں۔ لفظ شروع عربی ہے اور اردو میں اصل معنیٰ میں ہی استعمال ہوتا ہے۔ اس کی جمع بھی عربی کے قاعدہ سے ہے۔ گو عربی میں یہ جمع مستعمل نہ ہو مگر ہماری زبان کا تصرف اس کو مہند کر کے استعمال کرے تو اس کو رائج کرنا ادب کی وسعت کی دلیل ہے۔ جب متلاشی جیسے بے شمار الفاظ ہماری زبان میں جگہ پا سکتے ہیں تو شروعات کے جگہ نہ پانے پر تعجب ہے۔ اس کے متعلق استاد مرحوم سے بھی استفسار کیا گیا تھا۔ انھوں نے اس لفظ کو جائز قرار دیا۔

حضرت نوح ناروی فرماتے ہیں کہ ابتدا میں اس لفظ کو میں نے تسلیم نہیں کیا مگر جب مرزا عبدالغنی ارشد گورگانی دہلوی (استاد حضرت سائل دہلوی) کے کلام میں دیکھا تو مجھے اپنی رائے بدلنی پڑی اور ماننا پڑا کہ اس کو ہماری زبان میں جگہ دی جا سکتی ہے۔ اس اثنا میں ایک صاحب نے علامہ مفتی کفایت اللہ صاحب سے بھی استفسار کیا تھا وہ بجنسہٖ مع جواب کے درج ذیل کرتا ہوں۔

مخدومی و محترمی! سلام مسنون

علمی حلقوں میں چند ماہ سے لفظ شروعات کے متعلق بحث جاری ہے۔ ایک طبقہ کے چند افراد کہتے ہیں کہ یہ لفظ فصیح اور صحیح ہے۔ دوسرا طبقہ جس کے مؤیدین زیادہ ہیں، اس لفظ کو غلط، غیر فصیح اور عوام کی زبان کا بتاتا ہے۔ علامہ سید سلیمان ندوی،

نیاز فتحپوری، مولوی عبدالمالک آروی، ڈاکٹر عندلیب شادانی، علامہ شاداں بلگرامی، جناب سیماب اکبرآبادی، حضرت آرزو لکھنوی، حضرت صفی لکھنوی، حضرت ثاقب لکھنوی مولانا حسرت موہانی، حضرت بیخود دہلوی، حضرت دل شاہجہانپوری، حضرت وحشت کلکتوی، نواب فصاحت جنگ حضرت جلیل دکن۔ حضرت شفق عمادپوری، نوح ناروی، آسی لکھنوی، حضرت ناطق گلاؤٹھی، حضرت جوش ملیح آبادی جیسے مستند اساتذہ اور ادبا نے بھی شروعات کو شروع کی بے قاعدہ جمع غیر فصیح اور عوام کی زبان کا لفظ قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ محتاط ادبا، شعراء اور ثقات اسے استعمال نہیں کرتے۔ اس کے جواب میں دوسری جماعت نے چند عامی ادبا اور شعراء کی رائیں پیش کرکے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ شروعات ہر طرح قابلِ استعمال اور فصیح ہے میں چاہتا ہوں کہ شروعات کے متعلق ہندوستان کے تمام مشاہیر مستند اور ثقات شعراء ادباء علماء اور فضلائے سے رائیں حاصل کروں تاکہ اردو زبان کا پایہ نہ گرنے پائے اور ناعاقبت اندیش غلط رو حضرات اپنی حرکات سے باز رہیں۔ اسی لئے آپ کو بھی تکلیف دے رہا ہوں۔ ازراہِ کرم اپنی اوّلین فرصت میں اس لفظ کے جواز و عدم جواز کے متعلق اپنی رائے سے مطلع فرمایئے اور ساتھ ہی یہ بھی تحریر فرمایئے کہ آپ نے کبھی اس لفظ کو استعمال فرمایا ہے یا نہیں۔ یہ لفظ غلط العوام فصیح میں ہے یا غلط العوام قبیح میں۔ آپ کے جواب کا بے چینی سے منتظر ہوں۔ ۲۰ اگست ۴۳ء

نیازمند خاکسار سید دل محمد شاہ منشی فاضل مولوی فاضل صدر السنہ مشرقیہ

گورنمنٹ ہائی اسکول رخصتی مقام لاہڈرہ۔ ڈاکخانہ بہرام۔ سررشتہ جالندھر

جواب از حضرت مفتی اعظمؒ

لفظ شروع عربی لفظ ہے اور مصدر ہے۔ اس میں الف تا بڑھا کر شروعات جمع کا صیغہ بنا لیا گیا ہے۔ مصدر سے اگر مصدری معنی مراد لیے جائیں تو اس کی جمع بنانا

خلاف اصل ہے کیونکہ المصدر لایثنی ولایجمع مسلمہ قاعدہ ہے لیکن جب کہ لفظ مصدر سے مصدری معنی مراد نہ ہوں بلکہ حاصل مصدر کے معنی مراد ہوں یا مصدر سے اسم مفعول کے معنی مراد ہوں یا مصدر کے انواع بتانے مقصود ہوں تو مصدر کی جمع بنائی جاتی ہے۔ جیسے رکعۃ، رکعات۔ سجدہ، سجدات، قول، اقوال۔ طہارۃ، طہارات۔ اجارۃ، اجارات۔ امانۃ، امانات۔ دیانۃ، دیانات وغیرہ۔ شروع کے مصدری معنی آغاز کردن ہیں۔ اس معنی کے لحاظ سے جمع بنانا تو خلافِ اصل ہے لیکن حاصل مصدر یعنی آغاز و ابتدا کے معنی لے کر جمع بنائی جائے تو مضائقہ نہیں ہے رہا یہ سوال کہ فعول کی جمع الف تا کے ساتھ فعولات آتی بھی ہے یا نہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ فعول کے وہ مصادر جو ذوات التاء ہیں ان کی جمع تو الف تا کے ساتھ مطرد ہے۔ جیسے نبوۃ، نبوات۔ خصومۃ، خصومات۔ حکومۃ، حکومات۔ دسومۃ، دسومات۔ اور جو مصدر غیر ذوات التاء ہیں۔ جیسے شروع، رکوع، سجود، نزول، ہبوط، صعود، سکون، قعود، جلوس، وجود ان کی جمع فعولات پر اگرچہ مطرد نہیں لیکن ان میں سے بعض مصادر کی جمع فعولات پر بنائی اور استعمال کی گئی ہے (یہ یاد رہے کہ یہ جمع مصدری معنی کے لحاظ سے نہیں بلکہ اسم مصدر یا حاصل مصدر کے معنی کے لحاظ سے ہے مگر لفظ مصدر کی جمع ہے) اسی طرح شروع کو حاصل مصدر کے معنی (آغاز) میں لے کر اس کی جمع شروع بمعنی آغازہا یا ابتداہا بن سکتی ہے۔ اگر یہ خیال ہو کہ شروعات کو شروع کی جمع قرار دینا اس وقت ممکن تھا کہ اس کو جمع کے معنی میں استعمال کیا جاتا لیکن اس کو صحیح سمجھنے اور استعمال کرنے والے مفرد کے معنی میں استعمال کرتے ہیں جیسے۔

قبا جسم کی تنگ سے تر ہوئی حیا کی یہاں سے شروعات ہے

(سائل دہلوی)

تو اس کا جواب یہ ہے کہ لفظ کے صحیح ہونے کے بعد یہ خیال لائقِ اعتنا نہیں ہے۔ کیونکہ عربی جمع کے متعدد الفاظ اردو میں مفرد کی جگہ استعمال ہوتے ہیں۔ جیسے لفظ اصول، اخبار، احوال، واہیات، خرافات، اسباب وغیرہ۔ ان تمام باتوں کے باوجود اکثر ادبا، شروعات کا لفظ استعمال نہیں کرتے، اس لئے میں بھی اس کے استعمال کو پسندیدگی کی نظر سے تو نہیں دیکھتا مگر استعمال کرنے والوں کو بھی مستحق طعن و تشنیع نہیں سمجھتا۔ والسلام

تصانیف

جہاں تک مجھے معلوم ہے اُستاد مرحوم کے چار دیوان مکمل ہیں اور ایک مثنوی نامکمل ہے۔ مگر یہ سارا ذخیرہ غیر مطبوعہ ہے اور سخت افسوس ہے کہ اب تک ان کا کوئی دیوان شائع نہیں ہوا۔ جب سائل صاحب کے فرزند اور بیگم صاحبہ لاہور چلے گئے تو سارا ذخیرہ اُن کے ساتھ لاہور چلا گیا۔ اور اب جبکہ دونوں ماں بیٹے وفات بھی پا چکے ہیں کیا اُمید کی جائے کہ سائل صاحب کی یہ عمر بھر کی کاوش کبھی منظرِ عام پر آسکے گی۔ مثنوی کا نام نورٌ علیٰ نور ہے۔ مغل دور کی منظوم تاریخ لکھ رہے تھے۔ زبان کی فصاحت و بلاغت میں یہ سائل صاحب کا شاہکار ہے۔ ایک شعر یاد آرہا ہے۔ جودہ بائی (زوجۂ جہانگیر) کے متعلق فرماتے ہیں۔

دونوں جانب سے کھری رہتی تھی   بات کی پوری تھی ہٹ کی بھوتنی

ایک چھوٹا سا سہروں کا مجموعہ سائل مرحوم نے ۱۳۴۶ھ م ۱۹۲۸ء میں چھپوایا تھا جس میں خود اُن کے بھی متعدد سہرے ہیں اور کچھ تاباں صاحب کے اور کچھ دیگر حضرات کے سہرے ہیں اور ایک بارہ غزلوں کا چھوٹا سا رسالہ راقم الحروف نے ۱۹۴۲ء میں "بارہ گجول" کے نام سے شائع کیا تھا۔ یہ نام خود مرحوم نے ہی تجویز فرمایا

تھا اور اس کی ابتدا میں بعنوان "عرض سائل" مندرجہ ذیل عبارت لکھوائی تھی۔ غور فرمایئے عبارت کیا ہے موتیوں کی مالا ہے :۔

"حقیقت اس پیش کش حقیر موسوم بہ "پارۂ کجکول" کی یہ ہے کہ میرے وطنی اور بیرونجات کے احباب کے تقاضوں نے مجھے ایسی حالت میں اپنا کلام طبع کرانے کے لئے تنگ کر دیا کہ میں آنکھوں میں پانی آنے کی وجہ سے نہ خود لکھ سکتا ہوں نہ پڑھ سکتا ہوں۔ علاوہ ازیں کاغذ کی گرانی اور کمیابی نے سخت تر مجبور کر دیا۔ جس عزیز سے اس بارے میں مشورہ کیا، نہ اس نے میری معذوری پر نظر ڈالی نہ میری کم مائگی پر۔ یہی کہا کہ جس طرح ممکن ہو اپنی زندگی میں ہی طبع کراؤ۔ میں اپنے معاصرین میں درجۂ امتیاز نہیں رکھتا کہ پاس ہوس ناموری کرتے ہوئے ان کے ارشاد پر فوری کاربند ہو جاؤں۔ میرے ذوقِ ادب نے میرے اس شغل کو جاری رکھا جس سے جلبِ منفعت یا ہوائے شہرت کا کچھ تعلق نہیں۔ میرا کلام ایسے محاسن سے معریٰ ہے جو شاعری میں ہونے چاہئیں اپنے شوق کو میں نے اپنے وطن اور مادری زبان تک محدود رکھا ہے۔ میرے کلام میں وہ خوبیاں نہیں جو میرے ہم عصروں کو خدا نے عطا فرمائی ہیں۔ نہ میں نے ان کی تحصیل میں جدوجہد کی نہ فصیح و بلیغ ہونے کا مجھے دعویٰ! دلّی کی بولی بولتا ہوں اور بس!

جن حضرات نے میری زبان پر نکتہ چینی کی ان کی صورت دیکھ کر میں نے صبر کیا۔ جن اصحاب نے مجھے اس حیثیت سے بلند پایہ سمجھا اخلاقاً اُن کا شکریہ ادا کیا اور دل میں شرمسار رہا۔ کبھی ذہن میرا اس طرف منتقل نہیں ہوا کہ میرا شمار زمرۂ اہلِ کمال میں ہے جو حضرات میری اس التماس کو میرا انکسار سمجھیں گے وہ مجھے جھوٹا سمجھیں گے میری اس گذارش کو جذبۂ فروتنی سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ حقیقت تھی جو میں نے عرض کر دی اور صاحبزادہ مولوی حفیظ الرحمان جو مفتی اعظم ہند کے جگر گوشہ اور میرے عزیز ترین رفقاء میں سے ہیں اس معاملہ کو ان کے سپرد کر دیا۔ ابو المعظم سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی

اپریل ۱۹۴۲ء

تلامذہ

اُستاد مرحوم کے شاگرد بے شمار ہیں۔ مگر افسوس کہ میری معلومات محدود ہے مجھے اس امر کا اعتراف ہے کہ میں اپنی کم آمیزی کی وجہ سے اپنے تمام بھائیوں سے واقف نہیں ہوں۔ جو حضرات مجھے معلوم ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں:۔

(۱) مولانا مولوی قیام الدین صاحب نادرؔ شاہجہانپوری (راقم الحروف کے حقیقی ماموں) (۲) جناب عبدالخالق صاحب نہالؔ سیوہاروی (۳) مولانا مولوی محمد حسن صاحب اخترؔ دہلوی (۴) جناب سبط حسن صاحب غافلؔ امروہوی (۵) جناب محشرؔ امروہوی (۶) جناب شاکرؔ دہلوی (۷) جناب پنڈت رتن موہن صاحب زتشی خارؔ دہلوی ابن زارؔ دہلوی (۸) مولانا مولوی سعید الدین صاحب وفاؔ دہلوی (راقم الحروف کی اہلیہ کے ماموں) (۹) جناب حافظؔ دہلوی (۱۰) جناب عبدالستار صاحب نعیمؔ دہلوی۔ (۱۱) جناب حافظ عبدالغفار صاحب مفتونؔ دہلوی (۱۲) احقر واصفؔ دہلوی۔ (۱۳) حکیم خلیل الرحمٰن صاحب نارؔ (۱۴) کشور جوہرؔ (حال صوفی عبدالحی دہلوی (۱۵) شیخ محمد اسحٰق صاحب نادرؔ دہلوی (یہ وہ صاحب ہیں جن کے نانا مولوی قاسم علی صاحب مرحوم جنابِ سائلؔ مرحوم کے اتالیق اور اُستاد تھے) (۱۶) جناب شیر سنگھ صاحب نازؔ دہلوی (۱۷) جناب غمگینؔ وارثی (۱۸) جناب کیفؔ دہلوی (۱۹) مولانا اسرار صابری (۲۰) ریاض الدین کامل نظامی۔

عوارض اور وفات

اگرچہ نواب صاحب مرحوم کو جوانی میں نقرس کی شکایت پیدا ہوگئی تھی اور اس کے متعلق وہ فرماتے تھے کہ یہ خاندانی شکایت ہے۔ پھر بھی مجموعی طور پر ان کی صحت قابلِ رشک تھی۔

۱۹۳۷ء میں اپنے چھوٹے صاحبزادے مرزا غلام نظام الدین کی سفارش کے لئے حیدر آباد تشریف لے گئے۔ صاحبزادے انگریزی فوج میں سپاہی تھے۔ نواب صاحب کا خیال تھا کہ حیدر آباد کی فوج میں تبادلہ کرادیں۔ چنانچہ ان کو حیدر آباد کی فوج میں میجر کا عہدہ ملا۔ حیدر آباد میں سائل مرحوم نے نواب منظور یار جنگ بہادر کی کوٹھی مقابل عثمانیہ یونیورسٹی میں قیام کیا۔ ایک روز شب میں آرام کرسی پر مصروفِ مطالعہ تھے۔ رات کے بارہ بجے کے قریب فارغ ہو کر استراحت کے ارادے سے پلنگ کی طرف جانا چاہتے تھے۔ پیر کے انگوٹھے میں تہمد کا کونہ اُلجھ گیا۔ ایک کولہے کا جوڑ اُتر گیا ہڈی چٹخ گئی۔ گیارہ ہفتے تک ہسپتال میں رہے اور ۱۹۳۸ء میں دہلی واپس آ گئے۔ جب سے آخر تک دونوں ٹانگیں اور نیچے کا دھڑ بالکل بیکار رہا، بلکہ اکثر پیروں میں زخم بھی ہو جاتا تھا اور کافی عرصہ تک رہتا تھا۔ پانچ چھ سال سے اختلاج بھی رہتا تھا۔ پانی اُتر آنے کی وجہ سے آنکھیں تقریباً جاتی رہی تھیں صرف اندھیرے اُجالے کا امتیاز باقی رہ گیا تھا۔ اس طویل بیماری اور معذوری کے زمانہ میں نواب افتخار علی خاں رئیس پاٹودی نے تبدیلِ آب وہوا کی غرض سے پاٹودی میں بُلایا۔ نواب افتخار علی خاں بن نواب ابراہیم علی خاں مرحوم سائل صاحب کے نواسے ہوتے ہیں۔ کیونکہ ان کی بھانجی شہر بانو بیگم نواب افتخار علی خاں کی والدہ تھیں۔

کئی بار تبدیل آب وہوا کی غرض سے پاٹودی تشریف لے جاکر قیام کیا۔ آخری بار بھی اسی سلسلہ میں تشریف لے گئے تھے مگر دوسرے تیسرے دن طبیعت زیادہ خراب ہو گئی اور جمعہ کی شام کو سخت تکلیف کی حالت میں دہلی واپس لایا گیا۔

بروز ہفتہ مورخہ ۱۵ ستمبر ۱۹۴۵ء مطابق ۷ شوال ۱۳۶۴ھ بوقت صبح ۱۰½ بجے اس دارِ فانی سے عالمِ بقا کی طرف کوچ کیا۔

راقمِ تذکرہ کے پاس گیارہ بجے خبر پہنچی۔ دولت خانہ پر حاضر ہوا۔ اس وقت

دولت خانہ پر مرحوم کے قریبی اعزہ میں سے کوئی نہ تھا آنکھوں کے نیچے اندھیرا آگیا۔ بڑی مشکل سے طبیعت پر قابو پاکر اس عبرتناک منظر کو دیکھا اور دل مسوس کر رہ گیا۔ آہ! بیگم صاحبہ ریاست پاٹوڈی میں ہی تشریف فرما تھیں اور صاجنرادے (مرزا قطب الدین محمد میاں) شہر دھرمسالہ میں تھے۔ شام کو بیگم صاحبہ ۵ بجے دہلی پہنچ گئیں۔

۸ شوال ۱۳۶۴ھ ۹ بجے صبح کو جنازہ لال دروازے سے اجمیری دروازے لے جایا گیا اور عربک کالج میں نماز جنازہ ادا ہوئی۔ اس وقت زعماء و مشاہیر میں سے جناب خواجہ حسن نظامی اور داغ مرحوم کے شاگرد پنڈت تربھون ناتھ زار دہلوی، کنور مہندر سنگھ بیدی مجسٹریٹ، لالہ دھرم پال گپتا ایڈیٹر اخبار "تیج" اور ان کے علاوہ ہر طبقہ کے سینکڑوں ہندو مسلمان موجود تھے۔ نماز جنازہ کے بعد موٹر کے ذریعہ جنازہ مہرولی لے جایا گیا اور درگاہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ میں اندرون صندل خانہ اپنے چچا اور دادا کے قریب اس مکارمِ اخلاق اور علم و ادب کے آفتاب عالمتاب کو خاک میں چھپا دیا گیا۔ حضرت بیخود دہلوی بھی دفن کے وقت تشریف لے آئے تھے۔

کس قدر حسرت ناک تھا وہ دن جب سائل صاحب کا جنازہ اُٹھ رہا تھا۔ یہ سائل دہلوی کا جنازہ نہ تھا مشرقی تہذیب، مشرقی تمکین و وقار کا جنازہ تھا۔ دہلی مرحوم کے روایتی اخلاق و مکارم اور دلّی کی گلیوں کی "ذوقی" جاذبیت کا جنازہ تھا جس کو ہم نے اپنے کندھوں پر لے جاکر اسی سرزمین میں دفن کر دیا جہاں سے یہ سرچشمہ پھوٹا تھا یعنی یادگار سطوتِ اسلام گہوارۂ عروج اقوام جوار مسجد قوۃ الاسلام۔

جب استاد مرحوم اور ان کی توجہات کا تصور آتا ہے گلا گھٹنے لگتا ہے، وحشت ہونے لگتی ہے۔ میں اپنے آپ کو ایسے پروانہ کی مانند سمجھتا ہوں جس کو محیط شش جہت تاریکی میں دور سے شمع کی روشنی نظر آجائے اور وہ اپنے پورے جنونِ

شوق کے ساتھ لپکے، ناگاہ شمع گل ہو جائے اور وہ چار سو سر ٹکراتا پھرے۔

بہر حال شہر میں متعدد تعزیتی جلسے ہوئے مرثیے پڑھے گئے۔ مضامین شائع ہوئے۔ ایک قابلِ ذکر وہ تعزیتی اجتماع ہے جو مورخہ ۲۷ اکتوبر ۱۹۴۵ء کو جناب نوح ناروی کے اہتمام سے صاحبزادہ قطب الدین محمد میاں کی زیرِ صدارت سائل مرحوم کے دولت خانے پر منعقد ہوا تھا جس میں دہلی اور بیرونِ دہلی کے اکثر شعراء اور مشاہیر نے شرکت کی۔ اور بے شمار تعزیتی قطعات و رباعیات اور نظمیں پڑھی گئیں۔ مرحوم کے متعلق جو نظمیں کہی گئیں اُن میں سے بعض درج ذیل کرتا ہوں:۔

مرثیے

(قطعہ از جناب سید وحید الدین صاحب بیخود دہلوی)

مرنے کا زندگی میں نہ رنج و محن گیا ۔۔۔ بیخود کو داغ دے کے ہر اہلِ وطن گیا
ساحر نے مر کے بزمِ سخن کو مٹا دیا ۔۔۔ سائل کے ساتھ قبر میں لطفِ سخن گیا

نوحۂ وفات حسرت آیات عالیجناب ابو المعظم نواب سراج الدین احمد خاں صاحب سائل دہلوی

(از جناب پنڈت تربھون ناتھ زتشی زار دہلوی)

تھا کبھی جنت نشاں اُجڑا وطن ہندوستان ۔۔۔ یہ جہاں آباد دہلی جس کی تھی روحِ رواں
وجہ عظمت اس کے تھے جو لُٹ گئے وہ خانداں ۔۔۔ اب نہ باقی کارواں ہے اور نہ میرِ کارواں
شعلۂ بربادی و نکبت نے پھونکا آشیاں ۔۔۔ ہو گئے علم و ادب کے سب مربّی لامکاں
کُہنہ تہذیب و تمدن کی پریشاں ہے دُکاں ۔۔۔ کاملانِ خطۂ دہلی ہوئے بے خانماں
صوفیا آنکھوں سے اوجھل ہو لیا ہیں سب نہاں ۔۔۔ شین و بین ان کے لئے کرتے ہیں اب کس دیاں
اب نہ خسرو ہیں نہ اُن کے عہد کے گوہر فشاں ۔۔۔ ہو گئے انمل پہیلی اور مکرنی چیستاں
میر، سودا، مصحفی اللہ کو پیارے ہوئے ۔۔۔ ذوق، مومن اور غالب کا مٹا نام و نشاں

اب ضمیر و بسمل و سرور و ولی باقی نہیں / چل بسے مضطر نسیم و مصدر شعلہ زباں
یہ تو تھے متقدمیں، متاخریں کا ماجرا / کیا بیاں کیجے کہ ہیں چشمانِ گریاں خونچکاں
سالک و مجروح، حالی و ظہیر نغمہ سنج / انور و عارف، ذکی، آزاد یکتائے زماں
تھے ادیب و ارشد و ویراں اسی گھر کے چراغ / تھے یہیں داغِ فصیح الملک اُستادِ جہاں
شیفتہ و نیر درخشاں تھے ایسے تاجور / دلی ان کے دم سے دلی تھی، یہ تھے دلی کی جاں
ثاقب و طالب فروغ و مہر اختر اور شمیم / سالم و مشتاق و جوہر تھے یہیں طب اللساں
راسخ و ساقی و تاباں اور اجمل خاں یہ سب / ایک اک کر کے ہوئے رہ گیر ملکِ قدسیاں
دیکھتے ہی دیکھتے اس باغ میں پت جھڑ ہوئی / اب نہ وہ غنچے نہ وہ گل ہیں نہ ہے وہ گلستاں
رہ گئے تھے چند خوش خو جو یہاں چھوٹے بڑے / مٹ گئے ان میں سے اکثر کو رہا یہ آسماں
ابتدا میں برق دہلی سے مرخص ہو گئے / بعد میں رونق ہوئے راہی سوئے باغِ جناں
شاعر و معجز سے پھر خالی ہوئی بزمِ سخن / پھر ہوئے فردوس منزل ساحرِ جادو بیاں
یادگارِ راسخِ مرحوم شیدا نکتہ رس / چل دیئے سوئے ارم پا کر اسے دارالاماں
ہو گئی ویراں سرا یہ دہلیٔ برباد و رشیں / جا بسے نواب سائل جب میانِ نوریاں
تھے سراج الدین احمد خان سائل دہلوی / مامنِ اخلاق و آداب و رواجِ باستاں
شاعر و ناقد ادیبِ بذلہ سنج و خوش خصال / تھے بہارِ باغِ داغِ بلبلِ ہندوستاں
وقفِ بہرِ دوستاں شفقت محبت گر رہی / تھی مروت آپ کی مختص برائے دشمناں
چشم نم ہیں اُن کے ماتم سے سبھی برنا و پیر / دل ہے میرا خونچکاں آنکھیں ہیں خونابہ فشاں
نوح بھائی آئے ہیں جہلم میں ہونے کو شریک / شمع کشتہ کے ہیں یہ پروانۂ آتش بجاں
ہم ابھی دوزخ میں ہیں اور تم ہوئے سدرہ نشیں / ہائے اے نواب بھائی تم کہاں اور ہم کہاں
ہوں اگر میں نغز گو دہلی سے باہر سینکڑوں / میں ہوں اربابِ وطن کا اپنے لیکن نوحہ خواں
جب کہیں ہوتے غزل خواں بھائی سائل سنتے سب / روزمرہ، چستِ بندش، ٹھیٹھ دلی کی زباں

دے خدا استاد زادی کو مری صبرِ جمیل | اور قطب الدیں کو عمرِ خضر عیش جاوداں
سالِ عیسیٰ کے لئے مخرج بنی ہے یہ دُعا | سائلِ شیوا بیاں ہو جنتی خلد آشیاں
۱۹۴۵ء

سنہ ہجری ملہمِ غیبی نے یوں افشا کیا

زار و دہلی پہ روا یہ جبر یہ قہرِ آسماں

۱۳۶۴ھ

بر وفاتِ حسرت آیات جناب ابو المعظم نواب سراج الدین احمد خاں صاحب سائلؔ دہلوی

(از جناب نوحؔ ناروی صاحب)

(اس نظم کی خصوصیت یہ ہے کہ ہر شعر مردف ہے)

آج دنیائے سخن کیوں موردِ آلام ہے | آج کیوں اربابِ فن میں ہر طرف کہرام ہے
آہ کاہش آہ کاوش آج دُونی ہو گئی | آہ دلّی آہ دلّی آج سونی ہو گئی
قوتِ ضبط و تحمّل سے رہا جاتا نہیں | مونھ کو آتا ہے کلیجہ کچھ کہا جاتا نہیں
دفعۃً تاریکئ قسمت کا پھیرا ہو گیا | مِٹ گئی ساری تجلّی گھپ اندھیرا ہو گیا
دل تڑپنے سے کوئی لحظہ سکوں پاتا نہیں | دامنِ تسکیں کسی صورت سے ہاتھ آتا نہیں
زمزمہ پردازیاں رنگیں چمن کی ہائے ہائے | معرکہ آرائیاں بزمِ سخن کی ہائے ہائے
آفتاب اسلاف کا زیرِ زمیں پوشیدہ ہے | کثرتِ گریہ سے جو دیدہ ہے وہ نم دیدہ ہے
حوض قاضی کی فضائیں خاک میں سب مل گئیں | لال دروازے کی اینٹیں فرطِ غم سے ہل گئیں
ہر در و دیوار پہ بے رونقی سی چھا گئی | وقت سے پہلے زمانے میں قیامت آ گئی
کم نہیں انسان کے حق میں کسی انساں کا غم | قہر ہے مرزا سراج الدین احمد خاں کا غم
داغ دے کر حضرتِ سائلؔ جہاں سے اٹھ گئے | داغ کی آغوش میں پہنچے یہاں سے اُٹھ گئے
داغ ہی کا داغ دنیا کے لئے کچھ کم نہ تھا | کونسا وہ دل تھا جو پُر داغ و صرفِ غم نہ تھا
بھول کر بھی عرضِ حاجت کی طرف مائل نہ تھے | تھا تخلّص صرف سائلؔ ورنہ وہ سائل نہ تھے

جانتے تھے خاص وہ اپنا تمنائی مجھے
کس کو بھائی میں کہوں کون اب کہے بھائی مجھے

پاک فطرت پاک سیرت اور اُن سا کون تھا
نیک نیت نیک خصلت اور اُن سا کون تھا

خوش ادائی وضع داری جامہ زیبی ختم تھی
دل رُبائی دل ستائی دل فریبی ختم تھی

قول فیصل حسب موقع یاد کیا کیا آئے گا
جو پڑے گی بحث اسے کیونکر کوئی سُلجھائے گا

کس کی تحقیقات پر فکرِ رسا اترائے گی
کس کی بولی مستند عالم میں مانی جائے گی

ہائے وہ ان کا تکلم وہ ادب دانی کی شان
ہائے وہ ان کا ترنم وہ غزل خوانی کی شان

تھا جہاں آباد میں جس سے وقارِ شاعری
تخت گہ سے اُٹھ گیا وہ تاجدارِ شاعری

دن گزارے زندگی کے حشمت و شوکت کے ساتھ
ملنے والا کوئی آیا تو ملے اُلفت کے ساتھ

تھے ہزاروں نکتہ ہائے خوب تر ہر بات میں
جمع تھے لاکھوں فضائل اک گرامی ذات میں

جو غزل لکھی وہ معنی کا خزینہ بن گئی
بیت جو نکلی قلم سے وہ نگینہ بن گئی

حرف رکھنا سہل تھا کب نکتہ چیں کے واسطے
لفظ جیسا تھا جہاں بھی تھا وہیں کے واسطے

قدر دانوں سے کوئی پوچھے یہ کیسی موت ہے
درحقیقت شاعری کی موت ایسی موت ہے

جس قدر احباب تھے اس رسم پر مائل ہوئے
ابنِ سائل جانشینِ حضرتِ سائل ہوئے

جب نگاہِ حسرت آگیں جانبِ مدفن گئی
سُرمۂ چشمِ بصیرت خاک مرقد بن گئی

سب کہیں آمین سُن کر اس دعائے نوح کو
دے جگہ فردوس میں اللہ اُن کی روح کو

نوحۂ وفات حسرت آیات عالیجناب ابوالمعظم نواب سراج الدین احمد خاں صاحب سائل دہلوی

(از جناب نہال سیوہاروی)

ہے جوشِ غم ہمہ تن، بے قرار ہے دلّی
کسی دُکھے ہوئے دل کی پکار ہے دلّی

فغاں کا عالمِ شعر و سخن سے شور اُٹھا
گری چمن پہ وہ بجلی چمن سے شور اُٹھا

رہینِ نوحہ گری ہر ادب شناس ہوا
دیارِ غالب و مومن اُداس ہوا

ظہورِ ظلمتِ غم بزمِ بے چراغ سے ہے
بلند شورِ غم کا سرزمینِ داغ سے ہے

دلِ جہاں پہ قیامت گذر گئی یارب
ضیائے نیّرِ رخشاں کدھر گئی یارب

جفائے خنجرِ دوراں سے دلفگار ہوں میں
ندیم! جام اُٹھالے کہ سوگوار ہوں میں

نکاتِ فن کئے اِک عمر جس نے حل، نہ رہا
دریغ ساقیِ میخانۂ غزل، نہ رہا

ز دیدہ موجۂ خونناب حاصل است مرا
چہ دشنہ در جگر از مرگِ سائل است مرا

بلند رتبہ و عالی مقام تھا سائل
جہانِ شعر و ادب کا امام تھا سائل

سخنوری میں مسلّم وقار تھا اُس کا
ہر ایک شخص عقیدت گذار تھا اُس کا

وہ کیف بارِ حیات آفریں غزل اُس کی
بہارِ تازہ کی صورت حسیں غزل اُس کی

وہ مثنوی میں طبیعت کا رنگِ جولانی
فرازِ کوہ سے بہتا ہو جس طرح پانی

جدا زمانے سے اندازِ شعر خوانی کا
ہر اک زباں پہ وہ ذکر اُس کی خوش بیانی کا

اسیرِ خوابِ اجل نغمہ خواں ہوا صد حیف
خموش طوطیِ ہندوستاں ہوا صد حیف

بیاں نہ ہو وہ مصیبت ہے رحلتِ سائل
وداعِ خلق و مروّت ہے رحلتِ سائل

ترے فراق میں خوں گشتہ ہر جگر ہے آج
شبیہِ غالبِ مرحوم تو کدھر ہے آج

گذر جہاں تھا وہ راہیں تلاش کرتی ہیں
ترے وطن کی نگاہیں تلاش کرتی ہیں

قطعۂ تاریخ وفات

(از سید معشوق حسین صاحب اطہر ہاپوڑی)

وفاتِ حضرتِ سائل سے ہو گیا تازہ
وفاتِ داغ فصیح الکلام کا صدمہ

زبان اُن کی وہی تھی جو داغ کی تھی زباں
وہی تھا رنگِ سخن اور وہی تھی طرزِ ادا

جنابِ ثاقب و بیتاب کی یادگار تھے وہ
انھیں کے دم سے تھا زندہ کمال غالب کا

انھیں کی ذات تھی دلّی میں مایۂ نازش
وہی تھے اپنے زمانے کے افصح الشعرا

وہ خوش بیان و خوش الحان و ماہرِ فن تھے	وہ آپ خلق و مروّت میں تھے جواب اپنا
پچاس سال سے اُن سے تھی دوستی میری	پچاس سال سے تھے مجھ پہ وہ کرم فرما
نہ آج راسخ و شاعر نہ ساحر و سائل	زبانِ دہلی انھیں کے لئے ہے نوحہ سرا
سُنیں گے کس سے سُنائیں گے کس کو دلّی میں	سخن ہے کوئی نہ اب ہے کوئی سخن آرا
ہزار صدمے ہیں اک جانِ ناتواں میری	ہزار داغِ الم اک دلِ حزیں میرا
سُناؤں درد بھری داستانِ غم کس کو	سُنے گا کون یہ میری شکستِ دل کی صدا
اس انجمن میں ہے کیفی جو ایک شمعِ سحر	سلامت اس کو مرے مرنے تک تو رکھے خدا
دُعا کا وقت ہے اطہر دعا خدا سے کرو	ملے بہشت میں سائل کو درجۂ اعلا

سنینِ رحلتِ مرحوم حضرتِ سائل
لکھو کہ "شاعرِ شیریں بیاں جہاں سے گیا"
۱۳۶۴ھ

رُباعیات

سائل کی زبان تھی زبانِ دہلی	سائل کا بیان تھا بیانِ دہلی
دم اُن کا غنیمت تھا بہت دہلی میں	تھی دم سے انھیں کے آج شانِ دہلی

شاعر نہیں وہ شعر کے اُستاد بھی تھے	ماہر نہیں وہ ماہر نقاد بھی تھے
دلّی کے نہ صرف اہلِ زباں تھے سائل	وہ داغ سے اُستاد کے داماد بھی تھے

خوش فکر، خوش اخلاق، خوش آواز بھی تھے	بُلبل کی طرح زمزمہ پرداز بھی تھے
اندازِ سخن سب سے جُدا تھا ان کا	موجد بھی تھے وہ صاحبِ انداز بھی تھے

سائل کو بجا دعوئے یکتائی ہے	تحقیق میں ہم رتبۂ صہبائی ہے
اُستاد ہے وہ اور مکمل اُستاد	سائل کی مسلّم سخن آرائی ہے

قولہ تعالیٰ:- وَلَهُمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا
۱۳۶۴ھ

اُستادِ مرحوم نواب سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی کی یاد میں

(از حفیظ الرحمان واصف)

کیوں یکایک اہلِ محفل پر اُداسی چھا گئی؟
ہمدمو! دل تھام لو واصف کی باری آگئی

آج سائل! آہ سائل! کیا ہوا؟ کس نے کہا؟
کوچہ و بازار میں کیسا ہے محشر سا بپا؟

کیا سُناؤں تم کو اپنے درد و غم کی داستاں
کیا دکھاؤں تم کو اپنے دل کی چوٹوں کے نشاں

ختم ہیں آنسو مگر دل کو قرار آتا نہیں
زخم بھر جاتے تو ہیں لیکن نشاں جاتا نہیں

حسرت آگیں ہے کہانی شاعرِ مظلوم کی
مٹ گئی خاص اک نشانی دہلی مرحوم کی

دل کہ جو ہے صد ہزار اسرارِ فطرت کا امیں
آج لیکن ضبطِ غم کی تاب لا سکتا نہیں

ٹھیر جا دم بھر دلِ بیتاب رونے دے مجھے
مرقدِ سائل پہ گوہر بار ہونے دے مجھے

یادِ اجمل خاں تھی اب تک جاں گسل واحسرتا
آج صرفِ ماتمِ سائل ہے دل وا حسرتا

اے کہ تجھ سے گلستانِ مکرمت شاداب تھا
تو کتابِ عظمتِ اسلاف کا اک باب تھا

اے کہ تھی تیری نگاہوں میں قیامت کی کشش
دل کی گہرائی سے ہوتی تھی محبت کی کشش

جادۂ انوارِ قدسی تھا ترا تارِ نگاہ
تھی وجاہت تیری اک تمثیلِ تخلیقِ الٰہ

تیرا خُلق و اعتنا تھا در خورِ صد احترام
دل کا تیری اک نگاہِ مہر سے ہوتا تھا کام

محرمِ اسرارِ اُلفت دیدۂ بینا ترا
رُوئے روشن کی طرح تھا منجلی سینہ ترا

رشکِ تمکینِ ابوۃ تیری شانِ حلم تھی
پرتوِ شانِ نبوۃ تیری شانِ حلم تھی

آشکارا تیرے چہرے پر وقارِ باستاں
تیرے خط و خال میں مسطور گذری داستاں

آستاں تیری سخا و مرحمت کی سجدہ گاہ
یادگارِ شوکتِ دیرینہ تیرا فر و جاہ

شرحِ رازِ نیکی و احساں تکلم تھا ترا
جلوۂ صد صبحِ فردوسی تبسم تھا ترا

تیرا ہر فرمودہ نکہت بار و لطف انگیز تھا
تیرا اک اک لفظ علم و فن کی دستاویز تھا

جسم ہے موجود اور معدوم جانِ شاعری
مٹ گیا تیرے نہ ہونے سے جہانِ شاعری

دو سراج الدین تھے دلّی کے شمعِ انجمن ق ایک شاہِ ہند تھا اور اک شہنشاہِ سخن
ختم اُس پر آلِ بابر کی مہابت ہوگئی ختم تجھ پر ذوق و فردوسی کی عظمت ہوگئی
اک ظفر کیا لُٹ گیا مُغلوں کی صولت لُٹ گئی ایک سائل کیا اُٹھا دلّی کی دولت لُٹ گئی
کون اب ہم کو نکاتِ فن بتانے آئے گا کون اب سوئے "کتب خانہ" کرم فرمائے گا
محفلِ دہ نشیں کی جمعیت پریشاں ہوگئی رونے والی شمع اک تھی وہ بھی اس کو رو گئی
طاقتِ صبر و تحمل دل سے اب مفقود ہے چارہ گر جا! چارہ فرمائی تری بیسود ہے
کوچۂ رضواں میں جب سائل نے جا کر دی صدا زمزمہ سنجانِ طوبیٰ نے پکارا، مرحبا!
مرحبا اے ہم صفیرِ مومن و داغ و حزیں مرحبا اے میہمانِ جلوہ گاہِ حورِ عیں
ہو مبارک تجھ کو فضل و رحمتِ پروردگار ہو مبارک تجھ کو باغِ خلد و طرفِ جوئبار

خاکِ مہرولی کہ مہدِ رفعتِ اسلام ہے
اب وہیں پوشیدہ واصف آفتابِ شام ہے

دِلّی کا ایک مشاعرہ

(از رسالہ "مخزن" اکتوبر ۱۹۰۷ء)

اللہ اللہ ایک وقت تھا کہ دلّی کے مشاعروں کی دھوم تھی۔ باکمال مل بیٹھتے تھے۔ اور دادِ سخنوری دیتے تھے۔ اب زمانہ بدل گیا وہ لوگ چل بسے۔ کچھ صاحبانِ فن جو باقی تھے منتشر ہوگئے۔ اب نہ وہ صحبتیں ہیں نہ وہ جلسے۔ مدت سے دلّی میں کوئی بڑا مشاعرہ ہی نہیں ہوا۔ کچھ دنوں سے حضرت خواجہ باقی باللہ علیہ الرحمۃ کی درگاہ پر وہاں کے پیرزادہ صاحب کے ہاں ایک مختصر سی صحبت ہوتی ہے جو اس زمانے میں مغتنم ہے۔ ہر پنجشنبہ کی شام کو وہاں کچھ احباب جمع ہو جاتے ہیں۔ خان بہادر مولوی عبد الحامد صاحب جو ایک علم دوست بزرگ ہیں، اس بزم سے خاص دلچسپی رکھتے ہیں اور اکثر وہاں تشریف لے جاتے ہیں۔ ماہ ستمبر کے آخر میں اس

میں شریک ہونے کا مجھے بھی موقع ملا۔ لطف کی صحبت رہی مصرع طرح جناب شاد عظیم آبادی کی غزل سے جو اگست کے "مخزن" میں شائع ہوئی تھی لیا گیا تھا۔ اُس زمین میں عاشقانہ رنگ کی غزل لکھنا آسان نہ تھا مگر جناب نواب سراج الدین احمد خاں صاحب سائل اور سید وحید الدین صاحب بیخود نے عجب خوب شعر نکالے ہیں۔ (عبد القادر)

انوکھی آن پیدا کر، نرالی شان پیدا کر
دل پُر آرزو میں اور بھی ارمان پیدا کر

فدائی کوئی پہلے مجھ سا میری جان پیدا کر
پھر اس کے دل میں اتنی حسرتیں ارمان پیدا کر

پریشانی کو دل سے کھو کے اطمینان پیدا کر
اگر کچھ کام کرنا ہے تجھے اوسان پیدا کر

جفائیں تیری سہتے ہیں، دعائیں تجھ کو دیتے ہیں
کوئی تو اس سے بڑھ کر اور تو احسان پیدا کر

تمیز گریۂ معشوق و عاشق چشم تر یوں ہو
کہیں موتی لڑھکتے ہوں کہیں طوفان پیدا کر

عدو کو چاہتا ہے تو یہ میرے موُنھ سے نکلے گا
کوئی بہتان گھڑ مجھ پر کوئی طوفان پیدا کر

نگہ کو حکم دے چل پھر کے بازارِ محبت میں
جہاں جنسِ وفا بکتی ہو وہ دُکان پیدا کر

نگہبانی کو میرے دیدۂ بیدار ہی رکھ لے
نہیں تو اس طرح کے ایک دو دربان پیدا کر

مٹے جاتا ہے کیوں تو حورِ جنت پر عبث زاہد
حسینوں کی پرکھ معشوق کی پہچان پیدا کر

ادائیں دیکھ جب اپنی عدو کا دردِ دل جب سُن
ہماری آنکھ پیدا کر، ہمارے کان پیدا کر

مزے کی شوخیاں درکار ہیں اشعار میں سائل
سخن میں طرزِ رنگِ داغ تا امکان پیدا کر
(سائل دہلوی)

ابو المعظم مرزا سراج الدین احمد خاں صاحب سائل دہلوی

(از رسالہ "مشاعرہ" آگرہ - ماہ اکتوبر ۱۹۳۶ء)

۲۰ شوال ۱۲۸۱ھ سال ولادت ہے۔ والد کا اسم شریف نواب مرزا شہاب الدین احمد خاں ثاقب تخلص تھا۔ جو ارشد تلامذہ حضرت غالب سے تھے۔ حضرت غالب رشتہ میں

سائل صاحب کے والد کے پھوپھا بھی ہوتے تھے۔ مرزا غالب کی وفات کے دس ماہ بعد حضرت ثاقب بھی رہگرائے عالم جاودانی ہوئے جبکہ ان کی عمر ۲۷ سال چھ ماہ کی تھی اور سائل صاحب کی عمر چار سال چند ماہ کی تھی۔ سائل صاحب نے کہف عطوفت میں اپنے جدّ محترم نواب مرزا ضیاء الدین احمد خاں تخلص نیّر و رخشاں کے پرورش پائی۔ جب یہ پیدا ہوئے تھے تو ان کے دادا نے ان کا نام ابوالمعظم برجیس قدر رکھا تھا ستارہ شناسی میں اُن کو دستگاہ کامل تھی۔ اثراتِ کواکب کا لحاظ کرتے ہوئے۔ لیکن حضرت غالب نے خاندانی سلسلہ اسماء کو مدنظر رکھ کر سراج الدین تجویز کیا جو علَم قرار پا گیا۔ چودہ سال کی عمر میں فارسی و عربی کی تعلیم پا کر ان کو ذوقِ سخن ہوا۔ مرزا عبدالغنی ارشد تخلص نسل گورگانی کے شاہزادے اُن کے دادا مرحوم کی مصاحبت میں رہتے تھے۔ ہنگامۂ غدر فرو ہونے کے بعد سے ان کی مہربانی نے انھیں تحصیلِ فن کی جانب راجع کیا۔ رسالہ عبدالواسع ہانسوی اور حدائق البلاغت اُن سے تمام کر کے آغازِ شعر گوئی کیا۔ تخلص کی تجویز پر نواب غلام حسین خاں محو تخلص نے توجہ فرمائی جو حضرت غالب کے ہم زلف نواب غلام حسن خاں کے صاحبزادے تھے اور حضرت غالب کے شاگرد تھے۔ یہ سائل صاحب پر پدرانہ شفقت فرماتے تھے۔ چونکہ حضرت محو اپنے عہد میں بے مثال رمّال تھے چند تخلص تجویز فرما کر قرعہ ڈالا، کسی تخلص سے قرعہ نے موافقت نہ کی۔ اسی فکر میں تھے کہ حسنِ اتفاق سے ایک شریف صورت اور پریشان حال نے آکر ان کو سلام کیا۔ نواب صاحب نے ان سے دریافت کیا کہ آپ کس غرض سے تشریف لائے۔ اُنھوں نے کہا کہ میں سائل ہوں۔ نواب صاحب نے کہا کہ آپ تشریف رکھیں۔ نواب صاحب نے لفظ سائل پر قرعہ ڈالا جس کا جواب یہ ملا کہ یہ تخلص صاحبِ تخلص کو نہایت نام آور کرے گا۔ نواب صاحب نے کھڑے ہو کر اپنی قبا کی جیب سے ایک روپیہ نکالا اور سائل مذکور کو یہ کہہ کر پیش کیا کہ میں آپ کا احسان مند ہوں آپ نے تشریف لا کر مجھے ایک بڑی فکر سے

نجات دی۔ زاں بعد اپنے ملازم کو بھیج کر سائل صاحب کو گھر سے بلایا اور فرمایا برخوردار میں نے تمھارا تخلص سائل تجویز کیا ہے۔ سائل صاحب سلام کر کے اپنے کمرے پر چلے گئے۔ شام کو حضرت ارشد تشریف لائے ان سے عرض کیا کہ چچا جان نے یہ تخلص رکھنے کا حکم دیا ہے۔ جناب ارشد نے ناپسند کیا اور کہا کہ تم کو تخلص کی فکر فضول ہے تمھارا نام بہترین تخلص ہے یعنی سراج۔ سائل صاحب خاموش ہو گئے۔ جناب ارشد نے اس مسئلہ کو خود ہی نواب صاحب یعنی حضرت نیر کی خدمت میں پیش کر دیا۔ نواب صاحب نے حضرت نحو کو طلب فرما کر دریافت کیا اس وقت انھوں نے اپنے انہماک اور کد و کاوش کی کیفیت بیان کی اور وہ جواب قرعہ پیش کیا۔ اُس پر غور فرمانے کے بعد نواب صاحب نے فرمایا کہ اس تخلص کی سعادت اسے بہت مقبول اور مشہور کرے گی۔ چنانچہ سائل ہی تخلص قرار پا گیا۔ چند ہی غزلوں پر اصلاح لینی نصیب ہوئی تھی کہ جناب ارشد ایک معقول خدمت پر مامور ہو کر فیروز پور پنجاب چلے گئے یہاں وہ صحبت درہم برہم ہو گئی لیکن سائل صاحب نے بجائے خود مشق سخن جاری رکھی سلسلہ اصلاح کا یوں جاتا رہا۔ کہ اس وقت کے نام برآوردہ اہلِ سخن کی التفاتِ مشفقانہ نہیں دکھائی دی۔ ان کی خود پسندیاں سائل صاحب کو بھلی نہ معلوم ہوئیں۔ حضرت سائل نے دو تین بیاضیں مختلف اصنافِ کلام میں بطور خود سیاہ کر ڈالیں۔ نہ کسی سے اصلاح لی نہ صفِ شعرا میں داخل ہونا جائز رکھا۔ اُن کے بڑے بھائی نواب مرزا بہاء الدین احمد خاں طالب تخلص نہایت خوش گو شاعر تھے۔ انھوں نے ابتدائی سخنوری میں حضرت طالب اپنے حقیقی چچا نواب مرزا سعید الدین احمد خاں سے مشورہ سخن کیا تھا۔ بعد ازاں جہاں استاد حضرت داغ سے اصلاح لینی شروع کر دی تھی۔ چونکہ ٹھگی ڈکیتی کے محکمہ کے افسر اعلیٰ تھے۔ آپ کو وطن سے دور ملازمت پر رہنا پڑتا تھا۔ جب کبھی وہ بطور رخصت دہلی تشریف لاتے تھے حضرت سائل سے شعر گوئی اور شعر خوانی کی فرمائشیں

کیا کرتے تھے وہ اپنے بھائیوں میں ان کو زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ اکثر اکثر طرحیں دے کر غزلیں کہواتے تھے۔ اور سُن کر خوش ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ انھوں نے حضرت جلال مرحوم کی غزل کا ایک مصرع دے کر غزل کہوائی، اور ایسی پسند کی کہ بطور انعام اپنی سواری کا گھوڑا نہایت عمدہ عنایت کیا جس کی قیمت آٹھ سو روپے انھوں نے فرمائی تھی۔ اس گھوڑے نے گھوڑ دوڑوں میں جناب سائل کو ہزاروں روپیہ جتوایا۔ ایک مرتبہ انھیں اندور میں اپنے پاس بُلایا وہاں نواب یٰسین محمد خاں بہادر جاگیر دار ریاست بھوپال مقیم تھے حضرت طلب سے اور اُن سے رابطہ اخلاص بہت تھا اثنائے صحبت میں سائل صاحب کا تذکرہ ایک روز آگیا بایں الفاظ کہ مجھ سے چھوٹا ایک میرا بھائی ہے جو نہایت عمدہ شعر کہتا ہے اور اچھا شعر کہنے کے علاوہ شعر پڑھنا ایسا ہے کہ اس کے آگے بلند مرتبہ شاعر ہیچ معلوم ہوتے ہیں۔ نواب یٰسین محمد خاں کا اصرار اُن کے طلب میں ہوا۔ یہ تشریف لے گئے۔ وہاں چند روز شعر و شاعری کے خوب خوب جلسے رہے۔ جب یہ وہاں سے رخصت ہو کر وطن آئے تو ان کو جناب طلب مرحوم نے لائیں اینڈ لائیں کے کارخانہ کی بنی ہوئی دونالی بریچ لوڈنگ بندوق دی جس کی قیمت پانچ سو ساٹھ روپے تھی۔ وہ بندوق ان کے پاس بیس برس تک رہی۔ چند سال ہوئے کہ ایک ملازم کے ہاتھ سے شکار میں ٹوٹ گئی اور ایسی ٹوٹی کہ مرمت بھی اس کی قابلِ اطمینان ہونی ناممکن تھی طلب صاحب کی ناگہانی وفات نے سائل صاحب کو ایسا شکستہ خاطر کر دیا کہ یہ باوجود ذوقِ سخن ایک سال تک مصرع موزوں نہ کر سکے۔ صرف شکار کے شوق سے دل بہلاتے رہے۔ چند ماہ بعد سائل کو الم اپنی خانہ ویرانی کا ہوا۔ ایک سال کئی ماہ تک افسردہ خاطری ان کی قابلِ بیان نہ رہی۔ ۳۸ سال کی عمر میں اپنی والدہ محترمہ کے اصرار سے انھوں نے عقدِ ثانی کیا۔ یہ عقدِ ثانی ان کی چھوٹی بھاوج بیوہ سے ہوا

یعنی حضرت داغ کی دختر خوانده سے۔ دکن جاکر انھیں فخر تلمذ حضرت جہاں استاد فصیح الملک داغ سے حاصل ہوا مذاقِ سخن ان کا کسی قدر بدلا۔ چار پانچ سال صرف اصلاحِ کلام دلخواہ نصیب ہوئی۔ بعد وفات اُستاد مرحوم چند سال دکن میں رہے اُن کی والدہ کے سلسلۂ علالت نے مجبور کیا کہ یہ وطن سے دور نہ رہیں۔ بالآخر وہاں کی سکونت ترک کی اور وطن میں اقامت پذیر ہوئے۔ ان کی اہلیہ کا منصب سرکارِ دکن سے جاری ہے۔ ان کی خاندانی معاش ان کی ذات کی کفیل مصارف ہے۔

ان کی اولاد میں پہلی بیوی سے ایک لڑکا تھا جس کا نام رفیع الدین احمد خاں معظم مرزا تھا جو صغر سنی میں فوت ہو گیا تھا۔ موجودہ زوجہ سے کئی اولادیں ہوئیں چنانچہ دو فرزند ایک دختر بفضلہ تعالیٰ موجود ہیں۔ دختر کا عقد پنجاب میں ایک مغل خاندان میں ہوا۔ ان کے داماد خاں صاحب مرزا عبدالرب سشن جج ہیں۔ اُن کی دختر کا ایک نرینہ فرزند ہے۔ دو صاحبزادے سائل صاحب کے جوان ناکتخدا ہیں۔ ایک کا نام مرزا قطب الدین احمد خاں، دوسرے کا نام مرزا نظام الدین احمد خاں ہے۔ سائل صاحب کے اشغالِ جوانی میں شعر گوئی، شکار، گھوڑ دوڑ تھے۔ ضعیفی میں دو آخری ذوق باقی نہیں رہے۔ عمر تقریباً ۷۵ سال کی ہے۔ مریض اختلاج قلب بھی ہیں۔ اور ۱۴ سال سے خاندانی مرض نقرس میں مبتلا ہیں۔ دہلی کی قدیم وضع کا نمونہ ہیں باعتبار اخلاق و عادات اور لباس دہلی کی وضع اور زبان کو ان پر ناز ش ہے۔ نمونۂ کلام اُن کا ذیل میں درج ہے۔

مرزا قطب الدین احمد خاں

سنبھلنا تھا جب، جب نہ آیا سنبھالا ... اب آنکھوں سے رونا کہاں کا نکالا
لیا تیرے عاشق نے برسوں سنبھالا ... بہت کر گیا مرنے والا کسالا
ستم کی ادائیں ابھی سیکھتے ہیں ... جوابِ مژۂ مژگاں ہے ہو گا وہ بھالا
اسی گریہ کے تار سے میری آنکھیں ... بہا دیں گی ندی، بنا دیں گی نالا

ضدِ شمع و پروانہ ہے قیس و لیلیٰ کہ دل دادہ گورا ہے، دلدار کالا
لگا بحرِ اُلفت کا جس کو تھپیڑا ہوا موجِ طوفاں کا وہ تر نوالا
نہ دیر و حرم تک ہیں سوجھا ہیں جو تجسس میں جن کے جہاں چھان ڈالا
وہ نیرنگیاں ہیں مرے زخمِ دل میں کوئی گل کہے گا اسے کوئی لالا
سلامت رہے تربتِ بیکساں پر مہِ آسماں روشنی کرنے والا
بٹھا کر تمھیں شمع کے پاس دیکھا تم آنکھوں کی پُتلی وہ گھر کا اُجالا
یہ کیا پائمردی دلیرانکاں ہے نہ چھالے میں کانٹا نہ کانٹے میں چھالا
کیا دے کے دل کو جب اقرارِ الفت لڑی جان بھی اب وہیں لامحالا
دیا حکم ساقی کو پیرِ مغاں نے پئے محتسب جام و مینا اُٹھا لا
یہ سنتے ہی میخوار بولے خوشی سے ہمیں سا ہے یہ نیک اللہ والا

حقیقت میں سائل نے ذوقِ طلب سے
جہاں تک اُچھلتا گیا نام اچھالا

تمنائے موسیٰ کا پاسخ ملا تھا زبانِ عرب میں بجا لنترانی
تجلّی باری تعالےٰ نے اس کی سرِ طور فرمادی شرحِ معانی
ہوئی میری تخمیر جب آب و گل سے تو چنگاری اُلفت کی ملحق تھی دل سے
اُسی کی بدولت جب آئی جوانی شرر ریز ہے آہِ سوزِ نہانی
عرب میں ہے افسانۂ قیس و لیلیٰ، عجم میں ہے فرہاد و شیریں کا قصّہ
یہ دیر و حرم تک رہیں داستانیں، مری بڑھ گئی ان حدوں سے کہانی
ہوا حکمِ پیرِ مغاں مغبچوں کو پئے شیخ یوں بادۂ ناب لاؤ
صراحی ہو کوری پیالہ ہو سوندھا نئی عمر ساقی ہو مے ہو پُرانی
وہ کیا لذّتِ دشت گردی کو مانے وہ کیا محنتِ عشق کی قدر جانے

جنوں عشق کا بوالہوس کو ہو کیونکر نہ کچھ خاک پھانکی نہ کچھ خاک چھانی
تمھاری نگاہوں نے جو تیر مارے وہ پیوستہ رکھتا ہوں میں دل میں سارے
تمھاری عنایات کی ہے علامت تمھاری عطوفات کی ہے نشانی
تواضع کے آئین کیا جانے زاہد مدارات سے کیا ہو آگاہ عابد
جسے چھپ کے مے آپ آتی ہو پینی علانیہ کیا جانے گا وہ پلانی
ترے چشم و ابرو کے ایما کو دیکھا نہیں مطلقاً اُن کے حق میں یہ بے جا
کہا جائے اُن کو اگر وقت ہیجا کمانِ کیانی و تیغِ یمانی
حسیں سے حسیں تر مرقع کو دیکھا بعینہ ہر اِک عضوِ دلبر سے مانا
اداؤں کی تصویر لیکن نہ اُتری یہاں رو دیئے کلکِ بہزاد و مانی
کہیں کیوں نہ میخانے کا اُس کو داتا جہاں ہاتھ پھیلائے ہر آتا جاتا
کرے تر گلو تشنہ کامانِ مے کا عطا کر کے جامِ مئے ارغوانی
جمالِ خداداد کا پوچھنا کیا وہ زیور کا محتاج کس دن ہوا تھا
رُخِ سادہ کا موجبِ زیبِ زینت مرصّع جواہر نہ بحری نہ کانی
تخلص رکھوں میں نہ کیوں سائل اپنا ہو دن رات جب ہاتھ پھیلانا شیوہ
بغیر سوال و طلب ہو میسّر نہ کھانے کو دانہ نہ پینے کو پانی

تمھاری یاد فرمائی سے لوں میں ہچکیاں کب تک
بچے ان لطف کے جھٹکوں سے جانِ ناتواں کب تک
ابھی چٹکی میں آیا ہے نکل کر تیر ترکش سے
خبر کیا دوش سے ہٹتی میں آئے گی کماں کب تک
اجازت دے کے دیکھیں تو نگہبانِ حرم مجھ کو
کہ کب سے میں رہا صرفِ سجودِ آستاں کب تک

گنہگارانِ اُلفت ترکِ اُلفت کر نہیں سکتے
انھیں دے رحمتِ حق مژدۂ امن و اماں کب تک

جفا کا ہو کے خُوگر دیکھ لوں گا چرخ کو تم کو
کہ مل کر ظلم کر سکتے ہو تم پیر و جواں کب تک

خبر لے نوکِ نشتر دیکھئے کب نبضِ مجنوں کی
چبھوئے خار پائے ناقہ میں جورِ خزاں کب تک

نصیبا جاگ اُٹھا دستِ دامن خواہ و زنداں کا
یہ دو بے تاب کرتے انتظارِ کارواں کب تک

کیا برسوں تجسس اُن کا بتخانے میں کعبہ میں
زیارت ہو میسّر دیکھئے اُن کی کہاں کب تک

قرینہ اُن کی آرائش کا کیا دیکھا بتا قاصد
چلیں گے گھر سے کب تک اپنے پہنچیں گے یہاں کب تک

نگہبانِ درِ دلدار سے یہ پوچھنا ہو گا
کہ جائز ہے یہاں کب سے سجودِ آستاں کب تک

ہلالِ عید کی رویت کو دیکھو شیخ شعباں کو
کُھلی رہتی ہے کب سے مے فروشوں کی دُکاں کب تک

پچھتر سال گذرے خاک اُڑاتے در بدر پھرتے
ہوئے جائے گا سائل یوں ہی رسوائے جہاں کب تک

جور میں چرخِ ستمگر سے سِوا ہو جانا
سہل ہے دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا

میں سمجھتا ہوں تغافل کی ادا کو بھی ستم
کیا ہے گر ظلم نہیں ترکِ جفا ہو جانا

فیض ہے پیرِ خرابات کا یہ اے واعظ
آرزو مندِ مئے ہوش رُبا ہو جانا

زینت و زیب کی یہ غایتِ پایاں دیکھی
بن سنور کر انھیں پیغامِ قضا ہو جانا

نازکیِ طبع کی ہے تم میں ودیعت حق کی
جب خفا ہونے کو جی چاہے خفا ہو جانا

کٹ گئی عمر اسی وضع کی پابندی میں
بسملِ تیغِ ستم تیرِ ادا ہو جانا

حُسن کا دم وہ بھرے عشق کا دعوی وہ کرے
ہو جسے بندۂ تسلیم و رضا ہو جانا

تیغ و خنجر سے شہادت کے نہیں وہ محتاج
جن کو آتا ہے اداؤں پہ فدا ہو جانا

اپنے ہاتھوں کو سبق تو یہ پڑھا دے سائل
عوضِ دستِ طلب دستِ دُعا ہو جانا

کلام پر تبصرہ

(از جناب سیماب اکبر آبادی)

اخی محترم نواب سائل دہلوی کئی حیثیات سے آج ہندوستان کے ممتاز شاعر مانے جاتے ہیں۔ اول یہ کہ وہ دہلی کے موجودہ شعراء میں سب سے زیادہ معمّر ہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ نواب فصیح الملک حضرت داغ دہلوی مرحوم کے خویش ہیں۔ تیسرے یہ کہ اس خاندان کے ہیں جس کی زبان بالاتفاقِ جمہور مستند مانی گئی ہے۔ چوتھے یہ کہ وہ ہندوستان کے اکثر مشاہیر شعرا کے ہم نشین رہے ہیں اور اردو زبان انھیں کے خاندان یا گھر کی کنیز ہے۔

ایک ایسے جامع کمالات بزرگ کے کلام پر تبصرہ کیا جسے عمر اور طوالتِ مشق نے خود ایک بے عدیل مبصر بنا دیا ہے۔

برادرِ مکرم حضرت سائل دہلوی شعرائے سلف کا ایک اعلیٰ نمونہ ہیں۔ اُن پر شاعری پھبتی ہے اور انھیں دیکھ کر اسلاف کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ موصوف کی غزل سرائی کے متعلق یہ روایت عام ہے کہ عالمِ شباب میں جب وہ غزل پڑھتے تھے تو در و دیوار واقعی

رقصاں معلوم ہوتے تھے۔ اس ضعیفی کے عالم میں بھی جبکہ زندگی کی موسیقی بتدریج کم اور گم ہوتی جارہی ہے اگر اُن کی غزل پڑھنے سے درودیوار رقص نہیں کرتے تو ایک وجدانی کیفیت سوز و گداز اُن پر اب بھی ضرور طاری ہو جاتی ہے۔ کلام میں لطافت، لوچ، شیرینی اور ہمواری اپنی تمام دل نشینیوں کے ساتھ اب تک موجود ہے ؎

تمھاری یاد فرمائی سے لوں میں ہچکیاں کب تک
بچے اِن لُطف کے جھٹکوں سے جانِ ناتواں کب تک

"یہ لُطف کے جھٹکے" اس بے ساختگی کے ساتھ کسی دوسرے شاعر کے کلام میں بہ مشکل بھی نہیں مل سکتے۔

فصیح الملک مرحوم کے بعد اُن کی سی زبان اور انھیں کا سا خیال صرف حضرت سائل کے کلام میں ملتا ہے۔

حسن کا دم وہ بھرے عشق کا دعویٰ وہ کرے ہو جسے بندۂ تسلیم و رضا ہو جانا
وہ نیرنگیاں ہیں مرے زخم دل میں کوئی گل کہے گا اسے کوئی لالا
بٹھا کر تمھیں شمع کے پاس دیکھا تم آنکھوں کی پتلی وہ گھر کا اُجالا

خیال کی اس معنویت پر غور کیجیے کہ اگر آنکھوں میں پتلی نہ ہو تو گھر کا اُجالا کیا نظر آسکتا ہے بیکار ہے۔

نواب سائل صاحب فصیح الملک مرحوم کے عاشق ہیں۔ کوئی دن ایسا نہیں گذرتا کہ سو پچاس مرتبہ فصیح الملک کا نام آپ کی زبان سے نہ نکل جائے۔ یہ مرزا داغ مرحوم ہی کا فیض تصرف ہے کہ آج کلام سائل میں جا بجا اُن کا رنگ جھلک رہا ہے ؎

یہ کیا پائمردیٔ دیدۂ نسگاں ہے نہ چھالے میں کانٹا نہ کانٹے میں چھالا

حضرت سائل کی زبان وہی دہلی کی ٹکسالی ہے جس کا سکہ آج تمام ملک میں جاری ہے سلاست اور روزمرہ ان کے یہاں بحدِ اتم موجود ہے۔ محاورات کا انضباط مرزا داغ

مرحوم کی طرح ان کے یہاں بھی ہے، لیکن حضرت سائل خیال کی بلندی، اسلوب کی شگفتگی اور زبان کی سلاست میں اپنے تمام براوران خواجہ تاش میں ایک خاص امتیاز رکھتے ہیں۔ موسیقی اُن کے یہاں لفظ لفظ سے پیدا ہے، روانی کا کچھ ٹھکانا نہیں اور مضامین آفرینی تو "شملہ بمقدار علم" کے مطابق سائل صاحب کا حصّہ ہے۔ اس پیرانہ سالی میں بھی تحقیق الفاظ و محاورات کی عادت باقی ہے اور آپ اس وقت دنیائے ادب میں ایک معتبر اور مستند مفتیٔ ادب کا درجہ رکھتے ہیں۔ میری دانست میں تو آپ کا یہ درجہ آپ کی شاعری سے بھی زیادہ بلند ہے۔ فصیح الملک مرحوم کے بعد اُن کے کام اور نام کو زندہ رکھنے کا سہرا ابوالمعظم حضرت سائل دہلوی کے سر سب سے پہلے ہے اور اس کے بعد دوسروں کے۔ خدا اس پیر میکدۂ سخن کو میکدۂ سخن کے قیام تک باقی رکھے۔

(ماخوذ از رسالہ "شاعر" اکتوبر ۱۹۳۶ء)

نمونۂ کلام

غزل

(از رسالہ "مشہور" دہلی جنوری ۱۹۴۵ء)

ضیائے رُخ سے منوّر اگر شراب کہو — تو آفتاب کے پہلو میں آفتاب کہو
حجابِ جلوہ کو تم جلوہ زا حجاب کہو — اس آفتاب کے پردے کو آفتاب کہو
جب اضطراب کا آغاز ہے بنائے سکوں — سکونِ تام کو پایانِ اضطراب کہو
خموش پاؤ گے دے دے کے کوسنے مجھ کو — جواب اسی کو سمجھ لو تو لاجواب کہو
ابھی تھا یار ابھی دل نشیں ہے یادِ یار — کہو گے کیا اسے بس جاگتے کا خواب کہو
مُعائنہ نہ کہو اس کو داغِ دل کا تم — مری مُرادِ دلی کا فتوحِ باب کہو
عذاب ہے پئے میخانہ گو ورودِ شیخ — سلوک اُس سے جو ساقی کرے صواب کہو

مُرادِ اہلِ محبت ہے نامرادئ عشق　　جو کامیاب نہ ہو اس کو کامیاب کہو
الٹ پلٹ ہے تمہاری زبان کی بھی عجیب　　جسے دو گالی ابھی تم اُسے جناب کہو
تمہارے قول و عمل میں ہے شیخ کتنا فرق　　جسے بشوق کرو نوش اُسے خراب کہو

لیاقت اپنی سمجھتا ہے آپ سائل خوب
تم اُس کو دلّی کی دنیا کا انتخاب کہو

(از رسالہ "مشہور" دہلی اگست ۱۹۴۵ء)

زُعم نہ کیجو شمع رُو بزم کے سوز و ساز پر　　رکھیو نظر بجائے ناز خاطرِ پُر نیاز پر
فرقِ حیات و مرگ کا مرغِ چمن کے دل سے پوچھ　　دیتا ہے فوق دام کو چنگلِ شاہباز پر
خوابِ لحد ہے پُر سکوں، عہدِ حیات پُر الم　　موت نہ کیوں ہو طعنہ زن زندگئ دراز پر
سنگِ درِ حبیب پر ہوتا ہوں سجدہ ریز میں　　خلقِ خدا ہے معترض مجھ پہ مری نماز پر
منعمِ بے بصر یونہیں دیکھیے تا کجا رہے　　محوِ نشاط و خوشدلی نغمۂ تارِ ساز پر
فخرِ عمل نہ چاہیئے، سعیِ عمل ضرور ہے　　آنکھ رہے لگی ہوئی رحمتِ کارساز پر

در پہ بُتوں کے دی صدا سائلِ بے نوا نے یہ
فضلِ خدا رہے مدام حالِ گدا نواز پر

سُنا بھی کبھی ماجرا دردِ غم کا کسی دل جلے کی زبانی کہو تو
نکل آئیں آنسو کلیجہ پکڑ لو کروں عرض اپنی کہانی کہو تو
تمہیں رنگِ مے شیخ مرغوب کیا ہے گلابی ہو یا زعفرانی کہو تو
پلائے کوئی ساقیِ حور پیکر مصفّا کشیدہ پُرانی کہو تو
شبیہہ عدو کے قریں کا مرقّع، مجھے ہو عنایت تو احسان مانوں
بناؤں گا تعویذ دل کے سکوں کا یہ لے لوں تمہاری نشانی کہو تو
تمنائے دیدار ہے حسرتِ دل کہ تم جلوہ فرما ہو میں آنکھیں سینکوں

نہ کہہ دنیا موہنی سے جیسے کہا تھا مری عرض پر لن ترانی کہو تو
وفا پیشہ عاشق نہیں دیکھا تم نے، مجھے دیکھ لو، جانچ لو، آزما لو
تمھارے اشارے پہ قربان کر دوں ابھی مایۂ زندگانی کہو تو
کہاں میں کہاں داستاں کا تقاضا مرے ضبطِ دردِ نہاں کا ہے کستا
پھر اُس پر یہ تاکید بھی ہے برابر نہ کہنا پرائی کہانی کہو تو
مرے نامۂ شوق کی سطر میں ہے جگہ اک جو سادہ وہ مہمل نہیں ہے
میں ہو جاؤں خدمت میں حاضر ابھی خود بتانے کو اس کے معانی کہو تو
کرم کی اُمیدوں پہ بیمارِ اُلفت بتاؤ جیے روز مر مر کے کب تک
کیا جائے دشنہ سے یا زہر سے خود مداوائے دردِ نہانی کہو تو
رکھا ہے تخلص بمجبور سائل ہوئی اتنی جب احتیاجوں کی مشکل
ملے دانہ کھانے کو جب نہ مانگو میسر ہو پینے کو پانی کہو تو

ملے غیروں سے مجھ سے رنج، غم یوں بھی ہے اور یوں بھی
وفا دشمن جفا جو کا ستم یوں بھی ہے اور یوں بھی
کہیں وامق، کہیں مجنوں، رقم یوں بھی ہے اور یوں بھی
ہمارے نام پر چلتا قلم یوں بھی ہے اور یوں بھی
حبیب یا نہ رنج خلوت میں ستم یوں بھی ہے اور یوں بھی
مرے دُکھے ہوئے دل کو الم یوں بھی ہے اور یوں بھی
شبِ وعدہ وہ آ جائیں نہ آئیں مجھ کو بُلوالیں
عنایت یوں بھی اور یوں بھی کرم یوں بھی ہے اور یوں بھی
عدو لکھے مجھے نامہ، تمھاری مُہر اس کا خط
جفا یوں بھی ہے اور یوں بھی ستم یوں بھی ہے اور یوں بھی

مجھے لکھا تھا ہم بہرِ عیادت آنے والے ہیں
عدو ہمرہ ہے اب سمجھا کہ ہم یوں بھی ہے اور یوں بھی

نہ خود آئیں نہ بلوائیں شکایت کیوں نہ لکھ بھیجوں
عنایت کی نظر مجھ پر تو کم یوں بھی ہے اور یوں بھی

تم آؤ مرگِ شادی ہے نہ آؤ مرگِ ناکامی
نظر میں اب رہِ ملکِ عدم یوں بھی ہے اور یوں بھی

مرے سر پر بھی ٹوٹا ہے تمھارے پاؤں بھی چومے
غرض پیرِ فلک کی پشت خم یوں بھی ہے اور یوں بھی

مجھے باور ہے تم جھوٹے نہیں وعدے کے سچے ہو
قسم کیوں کھاؤ ناجائز قسم یوں بھی ہے اور یوں بھی

یہ مسجد ہے یہ میخانہ، تعجب اس پر آتا ہے
جنابِ شیخ کا نقشِ قدم یوں بھی ہے اور یوں بھی

یہ تیری سادگی آرائشِ زیور سے بڑھ کر ہے
خدا کے فضل سے نو تو رقم یوں بھی ہے اور یوں بھی

مجھے نواب بھی کہتے ہیں، شاعر بھی سمجھتے ہیں
زمانے میں ترا سائل بھرم یوں بھی ہے اور یوں بھی

عرصۂ حشر میں کچھ گل نہ کھلادے کوئی — داورِ حشر پہ تہمت نہ لگادے کوئی
بے کسی پوچھ نہ بیماروں کی اپنے ظالم — ان کو تسکین کوئی دے، نہ دوا دے کوئی
مے گسارو! مری توبہ کا بھروسہ کیا ہے — ابھی پی جاؤں اگر ضد سے پلادے کوئی
میں اگر شوق سے مے پیتا تو بیشک تھا گناہ — میرا کیا بس ہے اگر منھ سے لگادے کوئی
مہ جبینوں کی گلی میں ہے یہ سائل کی صدا — ایک دو بوسۂ لب بہرِ خدا دے کوئی

تاجِ ارشد جامِ غالب ماہ داغ
سائل اندر کاسہ دارد سہ چراغ

نگہ کے تیر چھلنی کر دیا کرتے ہیں سینوں کو
جدھر وہ دیکھ لیتے ہیں اُدھر دیکھا نہیں جاتا

یہ اودی اودی بدلی ہے یہ بادل کالے کالے ہیں
درِ میخانہ پہ سو سو برس کے پینے والے ہیں

ہمیشہ رہتے ہیں داغِ جنوں ہرے اپنے
خزاں کی رُت میں بھی رہتے ہیں کس بہار سے ہم

غلط ہے نامۂ اعمال سب یہ، داورِ حشر
ہم اپنی معصیتوں کا شمار رکھتے ہیں

چمن میں گل ہے تم ہو بام پہ اور شمع محفل میں
بلائے جان عاشق ہے جدھر جاؤ اُدھر دیکھو

صدا دیتا ہوں ہر در پر کہ ہے کوئی سخی ایسا
بھرے تاثیر کے ٹکڑے مرے کشکولِ شیون میں

تیرے اقراروں میں تاثیرِ حیاتِ جاوید
لذّتِ مرگ ودیعت ترے انکاروں میں

سائل سوال کر کے نہ کھونا، متاعِ آبرو
دنیا میں ایک چیز ہے بس آدمی کی بات

وہاں بھولے سے بھی وعدہ کا ایفا ہو نہیں سکتا
یہاں فرطِ محبّت سے تقاضا ہو نہیں سکتا

ادب دانِ رموزِ عشق مجھ سے رائے لیتے ہیں
کہ اس کوچہ میں ہو سکتا ہے کیا کیا ہو نہیں سکتا

برابر ہے جفا کیا ہے، وفا کیا
جو دل آیا تو پھر اچھا بُرا کیا

جب سنا میں نے بولی جل کے یوں خاکِ وطن
آپ کے جانے سے کیا سونا وطن ہو جائیگا

نقرے فریب دے کے دلِ مبتلا لیا
مجھ کو غریب جان کے تم نے بنا لیا

دل میں ہے درد، داغ کلیجہ میں، لب پہ آہ
سائل کو جو نصیب سے ملتا گیا، لیا

اسیرِ دامِ الم وہ ہیں ایک آرزو کے لئے
میں ان کے واسطے بے چین وہ عدو کے لئے

دعائیں مانگتے ہیں ہم قیامت آنے کی
جو تیرا وعدہ ہے اس ایک آرزو کے لئے

یہ عشق کے ہیں کرشمے، یہ دل کے کوتک ہیں
قبائے حضرتِ یوسفؑ چلی رفو کے لئے

تمھیں دکھانے کو لایا ہوں چاک پیراہن
تمھارا تارِ نظر چاہیے رفو کے لئے

بس اُٹھتے بیٹھتے سائل کے دو وظیفے ہیں
دعا تمھارے لئے، کوسنا عدو کے لئے

مرے نالوں سے گھبرانے لگے کیا میرے گھر والے — کیا کرتے ہیں شکوے راہ چلتے رہ گذر والے
انھوں نے بے پری پر بھی لگا دی آگ عالم میں — فدا کرتے ہیں شمع و گل پہ اپنی جان پر والے
عمل سب زہد و تقویٰ کے دھرے رہ جائیں گے زاہد — کوئی کامل اگر مل جائے تو کپڑے اتروالے
نہ کیجو اعتبارِ جبّہ و دستار اے ساقی — شرابِ ناب تیجھے دے بچو پہلے دام دھروالے
ستم ایجادیوں کی شان میں بٹّہ نہ آجائے — نہ کرنا بھول کر تم جورِ چرخِ کینہ ور والے
کمالِ بے کمالی نے کیا سائل ہمیں غمگیں
کہ تکتے رہ گئے بدگوہروں کا موتھ گہر والے

مجھ سے بے مہریِ دشمن کے گلے ٹھیک نہیں — چاہنے والوں کے دل یونہی تو پھٹ جاتے ہیں
شیخ میخانہ میں ہشیار ذرا چلئے گا — موتھ کے بل گرتے ہیں جب پیر رپٹ جاتے ہیں
پس شہرت بدلنا نام کا رکھنے سے بدتر ہے — تری تشہیر نے سائل تری توقیر کم کردی

جان لینا بس انھیں کو عاشقِ خانہ خراب — بستیوں میں جن کے گھر برباد و ویراں دیکھنا
خود کو بھی بُت کہو تو بغض للّٰہی کریں — کس قدر ہیں ہٹ دھرم سب اہلِ ایماں دیکھنا
حرف مطلب سُن کے سائل کا شرارت سے کہا — ان کی صورت، ان کی جرأت ان کا ارماں دیکھنا

یہ میخانہ میں کس کے رہن کا چرچا ہے مے نوشو — لبِ پیرِ مغاں پر قصّۂ دستار کس کا ہے
اس قدر لطف اسیری کا ملا ہے صیّاد — یاد مطلق نہ رہا مقصدِ پرواز مجھے

نظارے کی ہوس پر جلوہ ریزی نے کیا بیخود — نہیں معلوم کتنے دن میں جاکر ہوش ہوتا ہے
نئی کیفیتیں دیکھی ہیں ہم نے بادہ خواروں کی — یہ آپے میں نہیں ہوتے انھیں جب ہوش ہوتا ہے
بہار آئی تو وحشت میں نہ ہو کس طرح افزائش — اُمنگوں کا زمانہ ہے، لہو میں جوش ہوتا ہے

تم شیخ رات کو تو بنے پیرِ میکدہ — دن کو دکھائی دینے لگے پارسا مجھے

رشتۂ اُلفت کا بہت دن ہوئے ٹوٹے لیکن — اب بھی کچھ کچھ اثرِ یادِ صنم ہے تو سہی
نسبتِ داغ سے، دلّی کی زباں سے سائل — شاعری کا تری دنیا میں بھرم ہے تو سہی

باغ میں دیکھ کے اکثر گلِ تر کی صورت
یاد آجاتی ہے اس رشکِ قمر کی صورت

ایک حیراں اثرِ حسن سے اک ہے مضطر
دل کی صورت سے جدا ہوگی جگر کی صورت

بے بہا ہوتے ہیں عشاق کی آنکھوں کے سرشک
دیکھنے میں نظر آتے ہیں گہر کی صورت

قید خانے میں ترے زلف کی زنجیر تو ہے
اور دیوار کی صورت ہے، نہ در کی صورت

کالے بھورے پر و منقار کو ناداں نہ دیکھ
قابلِ دید ہے بلبل کے ہنر کی صورت

کوئے قاتل میں دل و دیدہ بچھے ہوتے ہیں
بارہا دیکھی ہے یہ راہ گذر کی صورت

اپنے بیمارِ محبت کی خبر لے جلدی
اس کی صورت میں جھلکتی ہے خطر کی صورت

حسن میں حور سے تشبیہ تجھے دیتے ہیں
ملتی جلتی ہے ارم سے ترے گھر کی صورت

نام سائل ہے مگر چشمِ طمع سے اس نے
کبھی دیکھی ہی نہیں صاحبِ زر کی صورت

حسیں اس قدر آئے بہرِ عیادت
کہ گھر بھر گیا ڈولیاں آتے آتے

تسلّی مجھے دی تشفّی عدو کو
کہاں جا براجے کہاں آتے آتے

پکڑ لائے سائل کو بزمِ سخن میں
بنی اس کے دم پر یہاں آتے آتے

فہرست مضامین